اِنتخاب
عزیز لکھنوی

مرتّبہ
خلیق انجم

انتخابِ عزیز لکھنوی

دَر بزمِ ذوق و شوق عزیزِ غزل طراز   سازِ آنچناں نواخت کہ جانِ سخن گداخت
آں گریہ راکہ بود گرہ در ضمیرِ عشق   آہے درونہ تاب زدودانہ دانہ ساخت

(علامہ اقبال)

سخن میں اور تو اہلِ تمیز ہی ہیں فقط
شہیدِ جلوۂ معنی عزیز ہی ہیں فقط

(اکبر الٰہ آبادی)

اِنتخابِ عزیز لکھنوی

مرتبہ
خلیق انجم

انجمن ترقی اردو (ہند) نئی دہلی

سلسلۂ مطبوعات انجمن ترقی اردو (ہند) ۱۵۱۲

سنہ اشاعت : 2001ء
قیمت : 60.00روپے
اڈیشن : تیسرا
کمپوزنگ وسرورق : محمد ساجد— انجمن کمپیوٹر ٹریننگ سینٹر، نئی دہلی
بہ اہتمام : اختر زماں
طباعت : ثمر آفسیٹ پرنٹرز، دہلی۔

Intekhab-e-Aziz Lucknavi

By : Dr. Khaliq Anjum

Price : 60.00
2001
ISBN : 81-7160-105-7

ANJUMAN TARAQQI URDU (HIND)
Urdu Ghar, 212, Rouse Avenue, New Delhi-110002
Ph : 3237210, 3236299, Fax : 3239547
E-mai/ : urduadabndli@bol.net.in

فہرست

حرفِ آغاز

لکھنؤ کی غزل پر الزام عائد کیا جاتا رہا ہے کہ یہ محض زبان، ضلع جگت، صنعت کاری، رعایت لفظی اور محاورہ بندی کی شاعری ہے۔ مضمون کے تعلق سے بھی لکھنؤ کی غزل کے بارے میں بعض لوگ یہ کہتے آئے ہیں کہ اس میں زیادہ تر سطحی قسم کی معاملہ بندی، چوٹی کنگھی کے قصے، فحاشی کی حد تک عریانی اور بازاری پن پایا جاتا ہے۔ اس بات کا اطلاق بڑی حد تک انشا، رنگین اور جرأت وغیرہ جیسے شاعروں پر کیا جاسکتا ہے۔ اگرچہ اُن کا بھی تمام تر سرمایۂ فن یہی نہیں تھا اور پھر یہ شاعر دبستانِ لکھنؤ کی نمائندگی نہیں کرتے۔ جہاں تک عامیانہ شاعری اور شاعروں کا تعلق ہے، اُس کی کمی تو نہ کبھی دہلی میں رہی ہے اور نہ لکھنؤ میں۔ لیکن اس درجے کی شاعری یا شاعر تاریخِ ادب کی قلم رو سے باہر کی چیز ہیں۔ اس لیے ادبی اقدار کے تعین میں ان حضرات کو قابلِ اعتنا سمجھنا درست نہیں ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ لکھنؤ کی تمام شاعری پر سطحیت، تصنع، بناوٹ اور عریانیت کا الزام عائد نہیں کیا جاسکتا۔ اسی طرح جیسے دہلی کے تمام شاعروں کے کلام کو وارفتگی، سوز و گداز، واردات اور کیفیات کی شاعری نہیں کہا جاسکتا۔ دہلی اور لکھنؤ کے دبستانی تصورات پر علی جواد زیدی نے اپنی کتاب "دو ادبی اسکول" میں بہت متوازن رائے پیش کی ہے۔ لیکن مقامی، لسانی اور ادبی تعصبات سے بلند ہو کر ان دبستانوں کی شاعری کا ابھی اور جائزہ لینا ضرور ہے۔

عزیز لکھنوی کا لکھنؤ ہی کے نہیں اردو کے ممتاز ترین شاعروں میں شمار ہوتا ہے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، علامہ شبلی نعمانی، علامہ اقبال، مولانا عبدالحلیم شرر، مولانا سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، اکبر الہ آبادی، مرزا ہادی حسن رسوا وغیرہ جیسے اہلِ نظر، صاحب بصیرت اور تنقید شعور رکھنے والے حضرات نے عزیز کے کلام کی تعریف کی ہے۔ بیسویں صدی کے عظیم شاعر علامہ اقبال عزیز لکھنوی کی شاعری سے بہت متاثر تھے۔ انھوں نے

عزیز کو جو خراجِ تحسین پیش کیا تھا۔ اس کا عزیز کے بہت سے نقادوں نے ذکر کیا ہے۔ لیکن اردو شاعری کا یہ ایک ایسا اہم واقعہ ہے جسے ایک بار اور دہرانے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ عزیز لکھنوی کے مجموعۂ کلام "گل کدہ" کا پہلا اڈیشن ۱۹۱۸ء میں شائع ہوا تھا جب دوسرا اڈیشن ۱۹۳۱ء میں شائع ہوا تو اُن کے شاگرد رحم علی الہاشمی صاحب نے "اقتباس آراء" کے عنوان سے عزیز کی شاعری کے بارے میں اُن کے معاصر اساتذہ سخن کی رائیں پیش کی ہیں۔ ان میں علامہ اقبال کی بھی رائے شامل ہے۔ اقبال نے اُن زمانے میں عزیز کے کلام کے بارے میں رائے دی ہے، جب وہ شہرت اور مقبولیت کی بلندیوں پر تھے اور جب خود انھیں فنِ شاعری میں اپنے مقام کا پورا احساس ہو چکا تھا۔ میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اقبال نے عزیز لکھنوی کے بارے میں اخلاقاً یا رسماً یہ رائے نہیں دی ہے۔ یہ اُن کے دل کی آواز ہے "گل کدہ" میں جو علامہ کی رائے نقل کی گئی ہے۔ اس کے طرزِ تحریر سے اندازہ ہوتا ہے کہ علامہ نے عزیز کے نام نجی خط میں اس رائے کا اظہار کیا تھا۔ اب وہ تحریر ملاحظہ ہو:

"میں آپ کے کلام کو ہمیشہ بنظر استفادہ دیکھتا ہوں۔

اپنے مرکز کی طرف مائلِ پرواز تھا حسن
بھولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا

سبحان اللہ! یہ بات ہر کسی کو نصیب نہیں۔ موجودہ ادبیات اردو کی نظر حقائق پر ہے اور یہ مجموعہ غزلیات اس نئی تحریک کا بہترین ثبوت ہے۔ میں نے اسے پنجاب یونی ورسٹی کے امتحان آنرز کے نصاب میں داخل کرنے کی تجویز کی ہے۔ آپ کے کلام کی جدت حیرت انگریز ہے۔ کیوں نہ ہو، آخر خاکِ پاک شیراز اور کشمیر سے آپ کی نسبت ہے"۔[۱۱]

عزیز لکھنوی کا ویژن بہت وسیع ہے۔ شاعری میں ان کی فکر عشق و محبت تک محدود نہیں ہے۔ اُن کا سماجی شعور عام غزل گو شاعروں کے مقابلے میں کہیں زیادہ بلند ہے۔ ان کی شاعری جو اُپج اور جدت ہے۔ وہ اُن کے معاصرین غزل گو شاعروں میں بہت کم کو نصیب ہوئی ہے۔ عصری زندگی کے مسائل پر اُن کی گہری نظر ہے۔ اسی لیے اُن کی شاعری میں زندگی کی تلخ اور شیریں حقیقتیں بہت واضح اور روشن نظر آتی ہیں۔ انھوں نے غزل کی روایتی مضامین کو اپنا موضوع نہیں بایا بلکہ وہ زندگی کو بہت قریب سے دیکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبال نے عزیز لکھنوی کے نام خط میں اُن کی اس خوبی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "موجودہ ادبیاتِ اردو کی نظر حقائق پر ہے اور یہ مجموعہ غزلیات (گل کدہ)

اس فنی تحریک کا بہترین ثبوت ہے۔ عزیز لکھنوی نے اردو کی روایتی شاعری سے بغاوت کر کے انفرادی آواز کی تشکیل کی کوشش کی، جس میں انھیں کامیابی حاصل ہوئی۔

میرؔ، غالبؔ، مومنؔ اور حسرتؔ کی شاعری سے عزیز لکھنوی بہت متاثر تھے۔ انھوں نے ان حضرات کا تتبع نہیں کیا، بلکہ ان سے اپنی تخلیقی شمع کو زیادہ روشن کیا اور غزل کو نئی فکر اور نئی معنویت سے روشناس کیا ہے۔

عزیز فارسی ترکیبوں اور لفظوں کا استعمال ایسی برجستگی سے کرتے ہیں کہ اُن کے اظہار میں گہرائی اور گیرائی پیدا ہو جاتی ہے۔ اب اُن کے چند ایسے اشعار ملاحظہ ہوں، جوں اردو کے ہر صاحبِ ذوق کے ذہن میں محفوظ ہوں گے:

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا
وہ میرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا

دل شکستہ ہو کے جا بیٹھے قریبِ آستان
جب صدائے دور باش آئی حریم ناز سے

کہہ کے بیمار سے یہ، بجھ گئی شمع
رات ہوتی ہے یوں بسر دیکھو

جس پہ اپنی طرف دیکھ کر وہ ہنستے ہیں
اب اُن کے واسطے کہیے کہاں سے آئے بہار

منحصر وقت پہ ہے گورِ غریباں کی سحر
جب نقاب اٹھیں گے، وہ سب کو جگا ہی دیں گے

کہنا کسی کا وصل کی شب بھولتا نہیں
اب سو رہو عزیز بہت رات آگئی

اِک روز جستجو تھی کسی اور کی ہمیں
یا آج ہے وہ دن کہ خود اپنی تلاش ہے

عمر رفتہ کو ذرا آواز دے اے زندگی
سننے بیٹھے ہیں وہ میری داستان آغاز سے

خلیق انجم

✲

جلوہ دکھلائے جو وہ اپنی خود آرائی کا — نور جل جائے ابھی چشم تماشائی کا
رنگ ہر پھول میں ہے حُسنِ خود آرائی کا — چمنِ دہر ہے محضر تری یکتائی کا
اپنے مرکز کی طرف مائل پرواز تھا حُسن — بھُولتا ہی نہیں عالم تری انگڑائی کا
اُف ترے حُسنِ جہان سوز کی پرزور کشش — نور سب کھینچ لیا چشم تماشائی کا
دیکھ کر نظمِ دو عالم مجھے کہنا ہی پڑا — یہ سلیقہ ہے کسے انجمن آرائی کا
گل جو گلزار میں ہیں گوش بر آواز عزیزؔ — مجھ سے بلبل نے لیا طرز یہ شیوائی کا

۱۶/ نومبر ۱۹۰۵ء

✲

جو یہاں ماسوا ہوا نہ ہوا — دور اُس سے کبھی خدا نہ ہوا
عہد میں تیرے ظلم کیا نہ ہُوا — خیر گذری کہ تو خدا نہ ہُوا
عشق کی رُوح کو دیا صدمہ — زندگی میں اگر فنا نہ ہُوا
یوں ہی گھٹ گھٹ کے مٹ گیا آخر — عقدۂ دل کسی سے وا نہ ہُوا
عشق ہے اِک طلسمِ رازِ بقا — مٹ گیا دل مگر فنا نہ ہُوا
کردیا دِل نے زندۂ جاوید — قیدِ ہستی سے میں رہا نہ ہُوا
نہ ملی داد ضبطِ عشق عزیزؔ — وہ کبھی صبر آزما نہ ہُوا

۱۰/ دسمبر ۱۹۰۶ء

کسی کے وعدے پر اتنا جو انتظار کیا ارے یہ کون سا دل تھا کہ اعتبار کیا
کچھ انتہا بھی ہے لُو بند ہو گئیں آنکھیں نگہ نے کام دیا جب تک انتظار کیا
بقدرِ جوشِ جوانی بڑھا غرور اُن کا کہ مے نے نشہ باندازۂ خمار کیا
ستم ہے لاش پر اُس بے وفا کا یہ کہنا کہ آنے کا بھی کسی کے نہ انتظار کیا
یقیں ہے صبح کو رہ جائیں کچھ نفس باقی اگر فلک نے شبِ غم کا اختصار کیا
سکون اس کی فنا کا سبب ہوا آخر کِسی نے دل کو کچھ اس طرح بے قرار کیا
کسی نے نزع کی اس طرح گتھیاں سلجھائیں سرہانے بیٹھ کے ہر سانس کا شمار کیا
کچھ اس میں مصلحتِ ذوقِ زندگی بھی تھی عزیز وعدہ کا اس کے جو اعتبار کیا

۱۰ر جولائی ۱۹۰۸

دل کو جہاں سکون ہوا جسم سَرد تھا وہ مدّتِ حیات تھی جب تک کہ درد تھا
زنجیرِ پا کے حلقے ہیں سب گردِ بَرد تھا صحرا جو ایک دفترِ اوراقِ گرد تھا
اب کھل رہا ہے نزع میں یہ رازِ حُسن و عشق وہ شوخ دل میں تھا میں سمجھتا تھا درد تھا
دل کی چمک میں جب تری صورت نظر پڑی ثابت ہوا کہ حُسن کا پردہ ہی درد تھا
گھبرا کے دیکھتے تھے وہ آئینہ بار بار محفل میں جب کہ خاتمۂ اہلِ درد تھا
اب تک ہیں یاد روح کو آثار نزع کے ماتھے پر اک شکن تھی کلیجے میں درد تھا
ہو ایسے چارہ گر سے مُداوا کی کیا اُمید جس سے سکونِ دل تھا وہی دل کا درد تھا
مقصودِ ضبط اصل حرارت کا حفظ ہے کھینچی کسی نے زور سے جب آہ سرد تھا
گویا شبِ فراق میں میں سر سے تا قدم آئینۂ تحمّلِ ایذائے درد تھا
یارب جوابِ پرسشِ اعمال دوں میں کیا! اِک دل دیا تھا تو نے مجھے وہ بھی درد تھا
جب تک عزیز عالمِ ارواح میں رہا بازارِ مصر اہلِ معانی بھی سرد تھا

۱۸ر ستمبر ۱۹۰۸ء

✲

الجھن کا علاج آہ کوئی کام نہ آیا! / جی کھول کے رویا بھی تو آرام نہ آیا
دل سینہ میں جب تک رہا آرام نہ آیا / کام آئے گا کس کے جو مرے کام نہ آیا
کام اس کے نہ کاش آئے وہ مغرور بھی یونہی / جیسے دلِ آوارہ مرے کام نہ آیا
یہ کہہ کے سرہانے سے وہ بیمار کے اٹھے . / صد شکر کہ مجھ پر کوئی الزام نہ آیا!
تجلّی سی کوئی شئے مرے سینہ میں کبھی تھی / سوچا تو بہت یاد مگر نام نہ آیا
تا حشر نہ بھولے گا عزیز اپنی شبِ ہجر / کیا رات تھی وہ رات کہ آرام نہ آیا!

۱۹ر ستمبر ۱۹۰۸

✲

میرے مرنے کا جو سامان تھا وہ بھی نہ ہوا / شرکتِ مجلس ماتم پہ وہ راضی نہ ہوا
حُسن ہی کیا تہ و بالا جو نہ عالم کر دے / دل ہی کیا جس میں کوئی جذبۂ فطری نہ ہو
واہ کیا خوابِ پریشاں تھی خیالی دنیا! / یوں تو سب کچھ ہوا پھر دیکھا تو کچھ بھی نہ ہوا
زلزلے عشق کی دنیا میں ہزاروں آئے / آپ پر کوئی بھی عالم کبھی طاری نہ ہوا
چند باتیں دمِ آخر جو کہی تھیں میں نے / کون فقرہ تھا جو سرمایۂ معنی نہ ہوا
پابجولاں تھا یہ میں زیورِ جنوں میں کہ کبھی! / قائلِ گردشِ ارضی و سماجی نہ ہوا
لذّتِ درد رہی بعدِ فنا بھی دل میں / حصۂ عمر مرے عشق کو کافی نہ ہوا
رات دن گو کہ رہا مشغلۂ خود بینی / تجھ پر آئینہ مگر منظرِ اصلی نہ ہوا
کون تھا دیکھ کے جو رجعتِ پیمانۂ مہر / قائلِ معجزۂ حضرتِ ساقی نہ ہوا؟
زلفیں کھولی گئی تھیں آج بڑے دعوے سے / خیریت تھی کہ عزیز آپ کا وحشی نہ ہوا

۲۰ر ستمبر ۱۹۰۸ء

دورِ آخر کے لیے جام شراب آہی گیا — بزم ساقی میں لبِ بام آفتاب آہی گیا
اے سکونِ موت کوئی جاگنے کی حد بھی تھی؟ — صبحِ ہجر آخر مری آنکھوں میں خواب آہی گیا
عشق نے سینچا لہو سے اپنے یوں گلزارِ حُسن — ہوتے ہوتے خونِ دل عہدِ شباب آہی گیا
کیا بتاؤں ابتدائے عشق کی مجبوریاں؟ — لاکھ سمجھایا دلِ خانہ خراب آہی گیا
انتہائے شوق میں گھبرا کے وہ کہنا مرا — کیا یہ سچ ہے! میرے نامہ کا جواب آہی گیا
حادثاتِ دہر ہیں وابستۂ اربابِ درد — لی جہاں کروٹ کسی نے انقلاب آہی گیا
ہے محبت کی نظر میں کیا مزا خود دیکھ لو — چار آنکھیں جب ہوئیں تم کو حجاب آہی گیا

اعتقادِ جذبِ چشمِ منتظر دیکھ اے عزیزؔ
وہ سیہ خانہ میں میرے بے نقاب آہی گیا

۱۰؍فروری ۱۹۰۹ء

دیکھ کر ہر در و دیوار کو حیراں ہونا ! — وہ مرا پہلے پہل داخلِ زنداں ہونا !
قابلِ دید ہے اُس گھر کا بھی ویراں ہونا — جس کے ہر گوشہ میں مخفی تھا بیاباں ہونا
جی نہ اُٹھوں گا ہے بے کار پشیماں ہونا — جاؤ اب ہو چکا جو کچھ تھا مری جاں ہونا
واہمہ مجھ کو دکھاتا ہے جنوں کے ساماں — نظر آتا ہے مجھے گھر کا بیاباں ہونا
اُف مرے اُجڑے ہوئے گھر کی تباہی دیکھو! — جس کے ہر ذرّہ پہ چھایا ہے بیاباں ہونا
حادثے دونوں یہ عالم میں اہم گزرے ہیں — میرا مرنا تری زلفوں کا پریشاں ہونا
الحذر ! گورِ غریباں کی ڈراونی راتیں — اور وہ اُن کے گھنے بال پریشاں ہونا
رات بھر سوزِ محبت نے جلایا مجھ کو — تھا مقدر میں چراغِ شبِ ہجراں ہونا
کیوں نہ وحشت میں بھی پابندِ محبت رہتا؟ — تھا بیاباں میں مجھے قیدیِ زنداں ہونا
ہوگا اِک وقت میں یہ واقعہ تاریخی — یاد رکھنا مرے کاشانہ کا ویراں ہونا

کچھ نہ پوچھو شبِ وعدہ مرے گھر کی رونق / اللہ اللہ وہ سامان سے ساماں ہونا
جوش میں لے کے اِک انگڑائی کسی کا کہنا / تم کو آتا ہی نہیں چاک گریباں ہونا
ان کی اُس کوششِ بے حد کا پتہ دیتا ہے / چارہ سازوں کا مری لاش پہ گریاں ہونا
عالمِ عشق کی فِطرت میں خلل آتا ہے / مان لو حضرتِ ناصح کا گر انساں ہونا
سُرخ ڈورے تری آنکھوں کے الٰہی توبہ! / چاہیے تھا انھیں پیوستِ رگِ جاں ہونا
ہو چلیں آپ کے بیمار کی آنکھیں بے نور / قہر تھا صبح کے تارے کا نمایاں ہونا
میں کروں ضبط ادھر ان کو پسینہ آئے / چاہیے یوں غمِ پنہاں کو نمایاں ہونا
اللہ اللہ ! یہ سلیقہ ترا اے شعلۂ طور! / کس طرح تو نے چھپایا ہے نمایاں ہونا
اُن سے کرتا ہے دمِ نزع وصیت یہ عزیز / خلق روئے گی مگر تم نہ پریشاں ہونا

۱۱ر ستمبر ۱۹۰۹ء

سچ کہو دل پر اثر کیا ہوگا ایسے تیر کا؟ / توڑے دیتی ہے نگہ جب آئینہ تصویر کا
ہے فنا آموز ہر اک خط تری تحریر کا / رنگ اُڑنا کہہ رہا ہے پیکرِ تصویر کا
بدگماں کو میری میت پر یقیں سکتے کا ہے / حکم ہے آئینہ دکھلاؤ مری تصویر کا
بعد میرے میرا ساماں سب تبرک ہو گیا / حلقہ حلقہ بٹ رہا ہے اب مری زنجیر کا
رنجِ مرگِ ناگہانی کوہکن کا مٹ گیا / جب نظر آیا کفن میں رنگ جوئے شیر کا
اُنگلیاں اُٹھنے لگیں لب تشنگانِ قتل کی / چاند مقتل میں ہوا طالع تری شمشیر کا
اِک خدائی جان دینے کے لیے تیار ہے / کیا قیامت ہے کمر سے باندھنا شمشیر کا
اِک نگہ نے تری طے کی صورتِ امید و بیم / سارا جھگڑا مٹ گیا تدبیر اور تقدیر کا
کر رہی ہے روح وقتِ نزع مشقِ اِتحاد / سانس کا رکنا سبب ہے، آپ کی تاخیر کا
مقتضائے یاس ہے تعجیلِ مرگِ ناگہاں / اور لطفِ شوق خواہاں ہے ابھی تاخیر کا
دل ہوئے جاتے ہیں ٹکڑے دیکھنے والوں کے بھی / کم نہیں شمشیر سے زخم آپ کی شمشیر کا
مدتیں گذریں کہ دل میں کوئی بات آتی نہیں / میں ہوں اور دن رات دہرانا تری تقریر کا
حُسنِ بے پردہ ہے یارب کیا ہی غیرت آفریں / پانی پانی ہو گیا ہے آئینہ تصویر کا
شرحِ جاں کاہیِ عشق اک غیر ممکن بات ہے / کاٹ کر لانا بہت آساں تھا جوئے شیر کا

کاش جل کے خاک ہو جائے دلِ حسرت نصیب!
فائدہ اتنا ہی ہو اس آہِ بے تاثیر کا

دوسرے کی انتہا وابستۂ تخیل ہے
اِک سرا تو ہے ہمارے پاؤں میں زنجیر کا

لکھ لیا سب قصۂ بربادیٔ عمرِ عزیز
کیا کلیجہ تھا ہمارے کاتبِ تقدیر کا

۱۰ر جنوری ۱۹۱۰ء

✲

شمع بجھ کر رہے گی پروانہ جل کر رہ گیا
یادگارِ حُسن و عشق اِک داغ دل پر رہ گیا

اس طرح کچھ تو دمِ آخر تڑپ کر رہ گیا
ایک افسانہ ترا اے قلبِ مضطر رہ گیا

ضعف میں کرتا بیاں کس طرح آخر دردِ دل
آپ کا بیمار اِک کروٹ بدل کر رہ گیا

مرتے مرتے بھی وہی ہم تھے وہی غم کی خلش
جو کھٹکتا تھا وہ کانٹا دل کے اندر رہ گیا

شوق نے کہہ کہہ کے یہ پہنچایا آخر قبر تک
دو قدم بس اور آگے کوئے دل بر رہ گیا

ہم تو دل ہی پر سمجھتے تھے بُتوں کا اختیار
نصب کعبہ میں بھی اب تک ایک پتھر رہ گیا

دل کی بے چینی کوئی دیکھے ذرا اس بزم میں!
جب کوئی آیا تو میں زانو بدل کر رہ گیا

نور لے کر دیدۂ یعقوب سے نکلا جو اشک
شب کو زنداں پر ستارہ اک چمک کر رہ گیا

اُن کے فریادی جو پہنچے دادخواہی کے لیے
صور کیسا دم بخود محشر کا محشر رہ گیا

چارہ سازوں سے دمِ آخر ترا بیمارِ غم
دل کی جانب کچھ اشارے سے بتا کر رہ گیا

قطرہ قطرہ اشک کا ہے مخبرِ ناسورِ دل
ہم کو اب رونا اِسی کا زندگی بھر رہ گیا

جا چکے احباب رو کر اُٹھ چکی ماتم کی صف
آپ کب آئے کہ جب خالی مرا گھر رہ گیا!

دیکھ لی دُنیا چلو شہرِ خموشاں اب عزیز
قابلِ دید اِک یہی دل چسپ منظر رہ گیا

۹ر فروری ۱۹۱۰ء

میرا قصہ ہے جُدا، اس کا ہے افسانہ جُدا
گو کہ ہے پاس مگر ہے دلِ دیوانہ جُدا

اور کچھ وسعتِ تقریر بڑھا دے یارب
سننے آتا ہے ہر اک اب مرا افسانہ جُدا

تو نہ خورشیدِ قیامت سے مقابل ہونا
داغِ دل! تیری حرارت کا ہے پیمانہ جُدا

ایک آبادیٔ پامال ہے یہ دشتِ جنوں
کاش ہر گوشہ میں ہوتا کوئی ویرانہ جُدا

میں تو بے ہوش ہوا ذوقِ نظر سے اپنی
تیری تاثیر تھی اے جلوۂ جانانہ جُدا

وقت اب وہ ہے کہ احباب تو احباب ہیں پھر
میری بالیں سے نہیں ہے کوئی بیگانہ جُدا

ربطِ دیرینہ سے باقی ہے تعلق پھر بھی
لاکھ کعبے سے بنائے کوئی بت خانہ جُدا

یہ بھی اِک تیرا کرشمہ ہے نگاہِ ساقی
ہے کوئی معجزۂ رجعتِ پیمانہ جُدا

ہم سے کس طرح بنے مردہ دلوں سے سر برہم؟
مذہبِ شیخ جُدا مشربِ رندانہ جُدا

شوقِ ساغر میں بڑھایوں میں حضورِ ساقی،
رعشہ ہاتھوں میں جُدا لغزشِ مستانہ جُدا

موجدِ صحبتِ حال آئے ہیں محفل میں عزیز
ہاں اب ان سب سے ہو اک نعرۂ مستانہ جُدا

۲۳؍اپریل ۱۹۱۰ء

اثر اے آہِ سوزاں کچھ نہ کچھ اپنا دکھا دینا
نہ آئیں وہ تو اک دن آگ ہی گھر میں لگا دینا

مریضِ ہجر کو تم زہر دینا یا دوا دینا
مگر بالیں سے دم بھر چارہ سازوں کو ہٹا دینا

خدا کا کام ہے یوں تو مریضوں کو شفا دینا
مُناسب ہو تو اک دن ہاتھ سے اپنے دوا دینا

تمہارا فرض ہے اپنی سی کوشش چاہیے تم کو
مگر آساں نہیں ہے میری ہستی کا مٹا دینا

شگاف اک ہو چلا تربت میں جاں آنے لگی مجھ میں
ذرا اے جانے والے قبر پر پھر مسکرا دینا

یہاں وہ وقت ہے اب دل کی قوت گھٹتی جاتی ہے
تمھیں تو کھیل ہے باتوں ہی باتوں میں رُلا دینا

کوئی تدبیر بن پڑتی نہیں کیا ہونے والا ہے؟
مجھے آساں ہوتا کاش اُنھیں دل سے بھلا دینا

مری میت پہ کس دعوے سے وہ کہتے ہوئے آئے!
ہٹا دینا ذرا ان رونے والوں کو ہٹا دینا

اُٹھیں گی آندھیاں غم کی جو ذرہ بھی رہا باقی
زمینِ وحشتِ غربت خاک میری سب اُڑا دینا

کسی کو دیکھ کر ایسا نہ ہو میں پھر بہک جاؤں
مجھے روزِ جزا اک دوسرا دل اے خدا دینا

تمھارے سامنے اک دفترِ رازِ محبت ہے
یہ دشواری کسی بیمارِ غم کا لب ہلا دینا

یہ کہہ کر قبر پر پھر یاد اپنی کر گئے تازہ
ارے او مرنے والے اب مجھے دل سے بھلا دینا

تعلق ہو نہ ہو دل میں بھرا ہے درد کچھ ایسا
جہاں سب رو رہے ہوں خود بھی دو آنسو بہا دینا

بہت گہری نظر ہے عشق پر حُسنِ ستم گر کی
خداوندا مجھے جو درد دینا لا دوا دینا

یہ مانا قلب کی جنبش نظامِ زندگانی ہے
ٹھہر جائے مرا دل چارہ گر ایسی دوا دینا

عزیز اِک دفترِ پند و نصیحت کھلنے والا ہے
بڑھے گر اختلاجِ دل تو ناصح کو دعا دینا

۲۰ر اگست ۱۹۱۰ء

نزع میں آئے، سکوں کچھ دل کو حاصل ہو گیا
کام جو آسان تھا اب وہ بھی مشکل ہو گیا

میری نا اُمیدیوں کا اس سے اندازہ کرو
جس کو اپنا دل سمجھتا تھا وہ قاتل ہو گیا

ہے وفورِ عشق میں دل اک طلسمِ بے خودی
خود خبر اپنی نہیں اس درجہ غافل ہو گیا

اُف رے ہیبت شامِ غم کی داغِ سینہ جل اٹھا
دن ہی سے روشن چراغِ خانۂ دل ہو گیا

شمع بھی بجھنے کو ہے بیمار بھی اب ختم ہے
جو شبِ فرقت کا مطلب تھا وہ حاصل ہو گیا

لے چلا تھا دل مجھے کل بزمِ جاناں میں عزیز
چلتے چلتے راہ میں بے چارہ غافل ہو گیا

۷ر ستمبر ۱۹۱۰ء

مجھ سے یہ قول ہے مرے ہر چارہ ساز کا
موقع نہیں رہا ہے اب اخفائے راز کا

رمز آشنا ہوں نغمۂ طاقت گداز کا
جذبِ کمندِ شوق ہے ہر رشتہ ساز کا

آنکھیں ہیں بند خوابِ جوانی میں مست ہیں
پردہ کھنچا ہوا ہے حرم گاہِ ناز کا

تقلید اب میں حضرتِ واعظ کی کیوں کروں؟
ساقی نے دے دیا مجھے فتویٰ جواز کا

اے رہروانِ عشق یہ ہے راہ پُر خطر، رکھنا ذرا خیال نشیب و فراز کا
ظاہر ہوا ہے میرے رُخِ نیلگوں سے اب انجامِ ضبط گریۂ طاقت گداز کا
ظاہر میں ایک سادہ ورق ہے یہ دل مگر نقشِ طلسمِ راز ہے اِک کارساز کا
ہے یہ کسی کی زلفِ شِکن در شکن کا قول کِس کو پتہ ملا مری عمرِ دراز کا
آیا ہے جو عرق مرے ماتھے پہ وقتِ نزع کھینچا ہوا ہے یہ نفسِ جانگداز کا
بالیں پہ میری آگئے کھولے ہوئے وہ بال اب کوئی اختیار نہیں چارہ ساز کا
بے ہودہ صرفِ عمر گرامی پہ ناز ہے یعنی کہ آسرا ہے کسی بے نیاز کا
دل کی چمک میں چشمکِ برقِ نظارہ ہے اندازہ کیجیے نظرِ امتیاز کا
تا چرخ جز فضا نظر آتا نہیں ہے کچھ اللہ رے زور نالۂ طاقت گداز کا
دنیا کہاں، مریض کہاں، زندگی کہاں؟ ضائع کرو نہ وقت کسی چارہ ساز کا
وہ آکے پوچھتے ہیں مرا حال اس سے آج حافظ ہی اب خدا ہے مرے چارہ ساز کا
ٹپکا ہے اُن کو دیکھ کے جو اشکِ خوں عزیز ہے اِک خزانہ عشق کے راز و نیاز کا

۲۹/اکتوبر ۱۹۱۰ء

رسم ایسوں سے بڑھانا ہی نہ تھا خدمتِ ناصح میں جانا ہی نہ تھا
بڑھ گئے کچھ اور اُن کے حوصلے رونے والوں کو ہنسانا ہی نہ تھا
دل کا بھی رکھنا تھا ہم کو کچھ خیال اس طرح آنسو بہانا ہی نہ کرنا ہے
کل زمانہ خود مٹا دیتا جنھیں ایسے نقشوں کو مٹانا ہی نہ تھا
بے پیئے واعظ کو میری رائے میں مسجدِ جامع میں جانا ہی نہ تھا
رہ گیا آنکھوں میں نشہ آپ کا نزع میں صورت دکھانا ہی نہ تھا

خود وہ دے دیتے تو اچھا تھا عزیز
کیا کہیں، یوں زہر کھانا ہی نہ تھا!

۱۱/دسمبر ۱۹۱۰ء

❋

دم لے لوں اُس سے اتنا تغافل نہ ہو سکا — اتنے ستم کیے کہ تحمل نہ ہو سکا
امکان بھر تو کوششِ اخفائے راز کی — چہرے کا تھا وہ رنگ تجاہل نہ ہو سکا
کیوں کر شبِ فراق کٹی یہ نہ پوچھیے — بس حد یہ ہے تصورِ کاکل نہ ہو سکا
گلشن کے منتظم کا میں قائل تو ہوں مگر — طے اُس سے قصۂ گل و بلبل نہ ہو سکا
پھول آ کے کیا چڑھاؤ گے تم میری قبر پر — تم سے چراغِ داغ بھی تو گل نہ ہو سکا
چھیڑا جو اُس نے، آپ نے بھی حال کہہ دیا — کیوں حضرتِ عزیز تحمل نہ ہو سکا

۵/ فروری ۱۹۱۱ء

❋

نیا نیا جو کسی شوخ کا شباب آیا — اُٹھا کے آئینہ دیکھا تو خود حجاب آیا
ہوئی کسی کے تصور میں اتنی محویت — نگہ کے سامنے اک نور کا حجاب آیا
نہ اُٹھ سکی کسی کمسن سے مدتوں جب تیغ — وفورِ جوش میں خنجر بکف شباب آیا
تمام انجمنِ وعظ ہوگئی برہم — لیے ہوئے کوئی یوں ساغرِ شراب آیا
مریضِ ہجر کی ایسوں کو قدر کیا ہوگی — اُٹھے ہیں نیند سے جب سر پہ آفتاب آیا
ہوئی اشارۂ ساقی سے بادہ پیمائی — نگہ کے زور سے گردش میں آفتاب آیا
یہ بات کہنے میں آتی ہے اے شبِ فرقت — کبھی نہ پاس کوئی وقتِ اضطراب آیا
دیا ہے سادہ ورق لا کے مجھ کو قاصد نے — کبھی جواب بھی آیا تو یہ جواب آیا
خدانہ کرے وہ پھر اُس دن مزاج پوچھیں گے — اگر کبھی دلِ گستاخ انھیں عتاب آیا
سمجھ لیا کہ تلون ترے مزاج کا تھا — اگر جہاں میں کبھی کوئی انقلاب آیا
عزیز اُس کی حیا تک ہے پردۂ دُنیا — قیامت آگئی جس دن وہ بے حجاب آیا

۲۵/ اگست ۱۹۱۱ء

غمِ عشق اگر ملا تھا تو کبھی قرار ہوتا
کوئی زور دل پہ ہوتا کوئی اختیار ہوتا

وہ کہیں اگر سرہانے دمِ اختصار ہوتا
تو یقین تھا کہ مرنا مِرا یادگار ہوتا

حرکت کبھی ارادی کسی شے میں پھر نہ ہوتی
دلِ بے قرار تجھ کو جو کہیں قرار ہوتا

مرے بعد جمع کرتے وہ خطوطِ شوق میرے
یہ صحیفۂ محبت کبھی یادگار ہوتا

مری لاش پر فلک نے کیے جمع ہنسنے والے
کوئی نوحہ پڑھنے والا کوئی اشک بار ہوتا

یہ لہو ہے میرے دل کا کوئی دل لگی نہیں ہے
کوئی پونچھتا جو آنسو تو میں اشک بار ہوتا

یہ مرے تمام اِشارے نہیں آج بے معانی
دمِ نزع کاش کوئی مرا راز دار ہوتا

دلِ مضطرب نہ سنبھلا نہ کبھی سنبھل سکے گا
مجھے پہلے کب تھا قابو جو اب اختیار ہوتا

مجھے درد اگر دیا تھا تو اثر بھی کاش دیتا
مرے حال پر کبھی تو کوئی اشک بار ہوتا

مری قبر پر وہ شاید کبھی آگئے ہیں ورنہ
یہ ہجومِ اہلِ دِل کا نہ سرِ مزار ہوتا

نظر کرشمہ پیا تجھے کیا اثر ملا ہے
ترے دور میں کبھی تو کوئی ہوشیار ہوتا

وہ کسی کا اُٹھ کے جانا وہ مرا یہ رو کے کہنا
تمھیں کیوں میں جانے دیتا اگر اختیار ہوتا

مجھے منظرِ دو عالم وہ دکھا کے کہہ رہی ہیں
تجھے کچھ نظر نہ آتا اگر انتظار ہوتا

وہ عزیز سے یہ کہہ کر پسِ پردہ چھپ گئے ہیں
تم ادا شناس ہوتے تو کچھ اعتبار ہوتا

۱۲ر نومبر ۱۹۱۱ء

ہمارے چہرے سے کیا کچھ عیاں نہیں ہوتا
تم آپ دیکھ لو ہم سے بیاں نہیں ہوتا

بتاؤ ایسے مریضوں کا ہے علاج کوئی
کہ جن سے حال بھی اپنا بیاں نہیں ہوتا

بس اضطرابِ گزارشِ نگاہِ حسن بھی دیکھ
فسانۂ غمِ دل یوں بیاں نہیں ہوتا

ہے اُن کی بزم میں ہر شخص اپنے عالم میں
کسی کا راز کسی پر عیاں نہیں ہوتا

وہ حُسنِ برقِ تجلی ہے جس کی ایک نقاب
ہزار پردے ہوں تو بھی نہاں نہیں ہوتا

جفائے ناز بہ تقریبِ رسمِ اُلفت ہے — یہی ہے خیر ابھی امتحاں نہیں ہوتا
ہمیں تو اُس نے دو عالم سے کھو دیا ورنہ — وہ کون ہے جسے عشقِ بتاں نہیں ہوتا
اٹھائے جا کے کہاں لطفِ جستجو کوئی — جگہ وہ کون سی ہے تو جہاں نہیں ہوتا
وہ کون لوگ ہیں جو ضبطِ عشق کرتے ہیں — نہاں کیے سے ہمارے نہاں نہیں ہوتا
بُرا ہو اے اثرِ بے کسیِ غم تیرا — جہاں میں کوی مرا رازداں نہیں ہوتا
اک ان کا دل ہے کہ دم بھر ہنسی نہیں رکتی — اِک اپنا حال کہ ضبطِ فغاں نہیں ہوتا
یہاں تو گھٹ کے نکلتا ہے دم وہ کہتے ہیں — کسی کا ضبط کبھی رائیگاں نہیں ہوتا
وہ ہولناک کیا ہے جنوں نے گھر میرا — کہ جنگلوں میں بھی ایسا سماں نہیں ہوتا
چلا ہوں کوچۂ جاناں میں دفن ہونے کو — ترے خلاف تو اے آسماں نہیں ہوتا
عزیز قابلِ عبرت یہ ناتوانی ہے — اب اپنا حال بھی ہم سے بیاں نہیں ہوتا

۱۶؍دسمبر ۱۹۱۱ء

طبقۂ خاک میں اک عالمِ پنہاں نکلا — دل بھر آیا جو سوئے گورِ غریباں نکلا
کس کے جلوہ نے یہ کی آئینہ بندی ہر سو — دیکھا جس ذرّے کو وہ دیدۂ حیراں نکلا
قبر تک لاش گئی ساتھ ہوا اک عالم — یوں رہا ہو کے ترا قیدیِ زنداں نکلا
ایک عالم کی نگاہیں ہیں مرے چہرہ پر — تیری محفل سے کچھ اس طرح میں حیراں نکلا
ہاتھ بڑھنا تھے کہ رگ رگ میں لہو دوڑ گیا — پھر وہی مرحلۂ چاکِ گریباں نکلا
دیکھیے وصل میں چھٹکے ہوئے تاروں کی بہار — پردۂ غیب نے دل چسپ یہ ساماں نکلا
روح اس پیکرِ تعمیر کی تھی ویرانی — ذرّہ ذرّہ میں مرے گھر کے بیاباں نکلا
اے جنوں موجِ صبا پھر ہوئی دامن کشِ گل — پھر وہی سلسلۂ چاکِ گریباں نکلا
تختۂ مشقِ نگہ ناز بنایا جس کو — چشمِ پُر آب وہ آئینۂ حیراں نکلا
مر گیا ایک نظر دیکھ کے گردوں کی طرف — تیرے بیمار کا جب کوئی نہ پُرساں نکلا
چارہ گر تھا جو مرے زخمِ جگر کا کل تک — آج دیکھا تو وہ خود لائقِ درماں نکلا

آہ وہ دِل کہ جو تھا معتکفِ استغنا
کوچۂ یار میں منّت کشِ درباں نکلا

خودکشی سے بھی ہوئی کاربرآری نہ عزیزؔ
سہل جو کام تھا وہ بھی تو نہ آساں نکلا

یکم فروری ۱۹۱۲ء

سوزِ غم دل سے اگر رو کے نکالا ہوتا
دیدۂ تر بھی اِک اُبھرا ہوا چھالا ہوتا

چارہ سازوں نے تو اپنی سی بہت کی تدبیر
کبھی تم نے بھی مرے دل کو سنبھالا ہوتا

نور ہوتا مری آنکھوں کا نہ زائل ہرگز
نزع میں پرتوِ رُخ تم نے جو ڈالا ہوتا

جمع کرتا بھی اگر اپنے حواس مختل
چند اوراقِ پریشاں کا رسالا ہوتا

آج وہ حال تھا دل کا کہ الٰہی توبہ
تم نہ آتے تو زمانہ تہ و بالا ہوتا

غیر کو دیکھ کے کرتے وہ نظر کاش عزیزؔ
زنگ خوردہ ہی کوئی تیر نکالا ہوتا

۱۲ر مارچ ۱۹۱۲ء

جو حوصلہ تھا ضبط سے وہ دل میں رہ گیا
دل فکرِ حلِ عقدۂ مشکل میں رہ گیا

نقشہ جو اُس کا دیدۂ بسمل میں رہ گیا
ناخنِ قضا کا عقدۂ مشکل میں رہ گیا

کیا سوچنا تعلقِ پنہاں کا بعدِ دفن
جو کچھ تھا اس کے دل میں مرے دل میں رہ گیا

جورِ فلک کا مرکزِ اصلی وہی ہے اب
جو نقطہ میرے دائرہ دل میں رہ گیا

اب بھی زیادہ عالمِ اسباب سے ہے وہ
جو کچھ کسی کے اجڑے ہوئے دل میں رہ گیا

سمجھے گا کیا حرارت دوزخ کو وہ بھلا
صدمہ تپِ فراق کا جس دل میں رہ گیا

جب وضعِ احتیاط سے نالہ کوئی رُکا
تصویرِ ضبط بن کے مرے دل میں رہ گیا

نظارہ سوزیٔ رُخِ جاناں تو دیکھیے
بس اک دھواں سا اُٹھ کے مرے دل میں رہ گیا

نظروں نے دیکھی شرم کی اک قدرتی کشش
انگڑائی لے کے جب کوئی محفل میں رہ گیا

دم توڑنے کے بعد بھی مدت تک اے عزیزؔ
کچھ اضطراب سا دلِ بسمل میں رہ گیا

۷ر جون ۱۹۱۲ء

اپنی ہی ذات میں خود اس کا نظارہ ہوتا
ہجر میں ہم نے اگر نفس کو مارا ہوتا

دیکھتا غیر کو کیوں دیدۂ کوتاہ نظر
اپنی ہستی کا میسّر جو نظارا ہوتا

کون ہے تیرے سوا روحِ روانِ ہستی
تو نہ ہوتا تو بھلا کون ہمارا ہوتا

تو نے اس لطف سے دیکھا تھا ازل میں اس کو
مر بھی جاتے تو کبھی دل نہ ہمارا ہوتا

دل ہی ہوتا نہ اگر پایہ شناسِ کونین
کوئی ہوتا نہ ہمارا نہ تمھارا ہوتا

غیر ممکن تھا کہ آتی نہ صدائے لبیک
مرنے والوں کو اگر تم نے پکارا ہوتا

شمعِ افسردہ جہاں، پھول ہیں پژمردہ جہاں
دل کو اُس گورِ غریباں میں پکارا ہوتا

آپ دم بھر کو اگر آ کے چلے بھی جاتے
ایک بیمار کو مرنے کا سہارا ہوتا

جلوہ اس شوخ کا دنیا کی نظر میں ہے عزیز
ایسی حالت میں بھلا کون تمھارا ہوتا

۱۸؍ مئی ۱۹۱۳ء

حُسن جب مُستعدِ جلوہ نمائی ہوگا
ہم نہ ہوں گے نہ سراپردۂ ہستی ہوگا

عشق تھا مجلسِ فطرت میں شریکِ شوریٰ
ورنہ یہ کیا تھی خبر سینہ میں دل بھی ہوگا

ہے کشش کس کی جو پھر جلوہ نمائی کا ہے عزم
کون اب جلوہ گہِ ناز میں باقی ہوگا

ان کو انگڑائی وہاں آئی یہاں دم ٹوٹا
یہ بھی کوئی اثرِ جذبۂ فِطری ہوگا

دفترِ عشق میں دل کو نہ سمجھنا مہمل
لفظ بھی ہوگا یہی اور یہی معنی ہوگا

ابر آزادِ زمانہ کو مقیّد نہ کرو
کون اشعار میں پابندِ قوافی ہوگا

۲۰؍ نومبر ۱۹۱۳ء

مختصر اک سطر میں حالِ دلِ دیوانہ تھا
بخیۂ زخمِ جگر میں سب مرا افسانہ تھا

تیری برگشتہ نگہ نے دل کا کیا عالم کیا
یاد آیا میکدہ تو اس گھر کا صاحب خانہ تھا

دِل میں کیوں پائی جگہ اور لب تک آیا کس لیے
آہ وہ نالہ کہ جو تاثیر سے بیگانہ تھا

جب کوئی ذرّہ مرے خاکستر دل کا اُڑا
جاتے جاتے اُن کی محفل تک وہی پروانہ تھا

یاد ہے ساقی پرستوں کو وہ منظر آج تک
چاندنی تھی بادۂ گل رنگ تھا پیمانہ تھا

حالِ دل اُس کو سُنانا گو نہ تھا امرِ محال
لیکن اس پر بھی یہ کارِ ہمّتِ مردانہ تھا

کیا بتاؤں اس کی چشمِ مست کا عالم عزیزؔ
میکدہ میں حُسن کے چھلکا ہوا پیمانہ تھا

۱۲/مارچ ۱۹۱۴ء

✻

دل کا چھالا پھُوٹا ہوتا
کاش یہ تارا ٹوٹا ہوتا

شیشۂ دل کو یوں نہ اُٹھاؤ
دیکھو ہاتھ سے چھوٹا ہوتا

چشمِ حقیقت بیں اک ہوتی
باغ کا بوٹا بوٹا ہوتا

خیر ہوئی اے جنبشِ مژگاں
زخم کا ٹانکا ٹوٹا ہوتا

آج عزیزؔ اُس شوخ نظر نے
خانۂ دل کو لوٹا ہوتا

۲۰/جولائی ۱۹۱۵ء

✻

ظالم تری گلی میں مرے بعد جو گیا
وہ یاد کر کے وقت مرا مجھ کو رو گیا

اب پھینکیے یہ خون بھری تیغ پھینکیے
کیا سوچتے ہیں آپ جو ہونا تھا ہو گیا

اپنی نگاہِ گرم کا جذبہ یہ دیکھیے
جتنا لہو تھا دل میں مرے خشک ہو گیا

افسوس آج دل پہ بھی قابو نہیں رہا
اِک شغلِ بے کسی تھا مرا وہ بھی لو گیا

میں دل کے ڈوبنے میں رہا محوِ بے خودی
کمبخت اپنے ساتھ مجھے بھی ڈبو گیا

آلودہ اشک سے مژۂ خوابناک ہے
تھا کون سا خیال جو موتی پرو گیا

تھی جس کے دم سے کیفیتِ لذّتِ نشاط
مدّت ہوئی عزیزؔ کہ وہ دل ہی کھو گیا

۷/اپریل ۱۹۰۸ء

✲

وعدہ کیا تھا پھر بھی نہ آئے مزار پر
ہم نے تو جان دی تھی اِسی اعتبار پر

غافل فریفتہ ہے چمن کی بہار پر
گل ہنس رہے ہیں ہستیِ بے اعتبار پر

وعدہ کیا تھا خواب میں صورت دکھائیں گے
سویا کیا ہمیشہ اِسی اعتبار پر

نازک دلوں کی سخت زبانوں سے ہے گریز
شبنم کو کب قرار رہا نوکِ خار پر

اٹھنے کو تیرے در سے اُٹھا تو مگر نہ پوچھ
جو کچھ گذر گئی دلِ بے اختیار پر

ایسے سے کیا اُمیدِ تسلی کی ہو بھلا
ہنستا ہو جو کہ گریۂ بے اختیار پر

آتا ہے کون فاتحہ پڑھنے کو اے عزیز
ہے اک ہجومِ عام ہمارے مزار پر

۹/نومبر ۱۹۱۱ء

✲

دل میں کچھ سوچ کے اندازۂ تاثیر بہار
پھینک دی لے کے مرے ہاتھ سے تصویرِ بہار

گرمیِ حسن سے کھنچ آئی ہے تاثیرِ بہار
یہ پسینہ ہے کہ ہے روغن تصویرِ بہار

خود بخود ٹوٹ گئے بندِ قبا جب ان کے
کیا دکھاتی ہے مجھے دیکھیے تاثیر بہار

دوڑتی پھرتی ہے مستانہ دماغ و دل میں
نشہ کی رنگ میں ڈوبی ہوئی تاثیرِ بہار

راز ہے راز ابھی اُن کی تجلی شاید
ہے ذرا شرحِ طلب معنیِ تاخیر بہار

چشمِ مخمور میں یہ سُرخ پڑے ہیں ڈورے
یا نظر میکدے میں آتی ہے تحریرِ بہار

تیرے آگے کسی غنچہ کا چٹکنا بے سود
لاکھ پُر معنی و پُرجوش ہو تقریرِ بہار

متصل کھل رہے ہیں پھول چلو دیوانو
چشمِ برراہ ہے ہر حلقۂ زنجیر بہار

یاد آتی ہے مجھے تیری جوانی طاہرؔ[1]
مٹ گئی صفحۂ معیار سے تصویرِ بہار

ایسا نازک تو کسی کا بھی نہ دل ہوگا عزیزؔ
روئیں کیوں کر تجھے اے کشتۂ تاثیر بہار

۲۷/جولائی ۱۹۱۳ء

---

[1] حکیم شیخ محمد طاہر طاہرؔ تلمیذ مصنف کہ در عین ریعان شباب رخت اقامت بربست ۱۲

کسی سے تیرے سوا خواہشِ کلام نہیں
جو تو نہیں تو زباں کو سخن سے کام نہیں

لرز رہا ہے کسی مست کا شکستہ دل
یہ دستِ ساقیِ پیماں شکن میں جام نہیں

صدا یہی جرسِ کارواں سے آتی ہے
چلو چلو کہ ٹھہرنے کا یہ مقام نہیں

مریضِ ہجر میں اب کیا رہا جو پوچھتے ہو
یہ حال ہے کہ اگر صبح ہے تو شام نہیں

عزیز بہرِ عیادت وہ آنے والے ہیں
مگر یہاں تو نفس میں بھی انتظام نہیں

۶؍اگست ۱۹۰۴ء

زندہ رہنے کی ہمیں راہ بتا جاتے ہیں
جاتے جاتے وہ کوئی بات بنا جاتے ہیں

عرضِ مطلب بہ تمنائے سکونِ دل ہے
وہ سُنیں یا نہ سُنیں ہم تو سنا جاتے ہیں

کچھ غرض حضرتِ ناصح کو نہیں مجھ سے عزیز
آ کے کمبخت مرا دل تو دکھا جاتے ہیں

۱۷؍اگست ۱۹۰۴ء

کوئی مریضِ غم کا دمِ واپسیں نہیں
اک جان ہے[1] سو وہ بھی کہیں ہے کہیں نہیں

ڈھونڈھا تمام عمر تجھے تو کہیں نہیں
کیوں کر کہوں کہ تو مرے دل میں مکیں نہیں

تا چند ضبطِ آہ کہ رُکنے لگا ہے جی
یا آج آسمان نہیں یا ہمیں نہیں

صرف اک نظر فریبیِ وہم و خیال ہے
کیا ہستیِ طلسمِ جہاں جب ہمیں نہیں

باز آئے ایسی موت سے گو تلخ ہو حیات
مرنے کا کیا مزا جو سرہانے تمھیں نہیں

سب ساکنانِ شہرِ خموشاں خموش ہیں
یہ رسمِ اِک نیا ہے یہاں جو کہیں نہیں

---

[1] لفظ ''سو'' اکثر اساتذہ کے نزدیک متروک ہے مگر مصنف کے خیال میں اس کے مفہوم کو دوسری کوئی لفظ ادا ہی نہیں کر سکتی ۱۲

یادش بخیر وہ دلِ ناکام و نامُراد — اس طرح کھو گیا کہ پتا بھی کہیں نہیں
کہتے ہیں ریختہ کو جو اس طرز پر عزیزؔ — کچھ لوگ اور شہر میں ہیں اک ہمیں نہیں

۱۹ر جنوری ۱۹۰۹ء

✵

یہ عالم ہے کہ اب سب چارہ گر ناچار بیٹھے ہیں — وہ خود بھی دیکھنے حالِ رخِ بیمار بیٹھے ہیں
ہجومِ عام ہے بالیں پہ سب غم خوار بیٹھے — وہ خود جب سے قریبِ بسترِ بیمار بیٹھے ہیں
پرستارِ صنم مایوسیاں کس سے کہیں اپنی — خدا سے بھی معاذاللہ اب بیزار بیٹھے ہیں
دمِ آخر مریضِ غم میں یہ کیسا تغیر ہے — مداوا کرنے والے جان سے بیزار بیٹھے ہیں
کہے کون اُن سے زائل ہو رہا ہے نور آنکھوں کا — وہ سر کھولے قریبِ بسترِ بیمار بیٹھے ہیں
شریک اس سانحہ میں تھیں فلک کی گردشیں بھی کچھ — پشیماں ہو کے اب وہ قبر پر بے کار بیٹھے ہیں
چھڑا ہے حلتِ صہبا کا مبحث بادہ نوشوں میں — جنابِ شیخ آپ اِس بزم میں بے کار بیٹھے ہیں
خیال اُن کا ہے، آشفتہ سری اُن کی، جنون اُن کا — جو دیوانے قریبِ دامنِ کہسار بیٹھے ہیں
یہ کیا حالت ہے میری کون سا وقت آ پڑا مجھ پر — الٰہی دور مجھ سے کیوں مرے غمخوار بیٹھے ہیں
یہ کہہ کر ہاتھ اُٹھایا جانبِ بندِ نقاب اُس نے — ابھی کچھ مدعیِ حسرتِ دیدار بیٹھے ہیں
یہ کیسا ہو چلا ہے رنگ یارب میرے چہرے کا — یہ کیوں پچھلے پہر سے سب کے سب ہشیار بیٹھے ہیں
وہی اس بزم میں جوہر شناسِ بزمِ ساقی ہیں — لئے جو دُرد کش پیمانۂ سرشار بیٹھے ہیں
ہر اِک ہچکی میں کیوں کر کھل رہی ہیں موت کے عقدے — فقط وہ دیکھنے یہ حالتِ بیمار بیٹھے ہیں
عزیزؔ اس رہگزارِ عشق میں اک یوسفستاں ہے — ہزاروں دل لیے ہم سے سرِ بازار بیٹھے ہیں

۱۹ر جنوری ۱۹۰۹ء

✵

کاش سنتے وہ پُر اثر باتیں — دل سے جو کی تھیں عمر بھر باتیں
بے سبب تیرے لب نہیں خاموش — کر رہی ہے تری نظر باتیں
کوئی سمجھائے آ کے ناصح کو — سُن سکے کون اس قدر باتیں

اُس کے افسانہ بن گئے لاکھوں — میں نے جو کی تھیں عمر بھر باتیں
دم اُلٹ جائے گا عزیز عزیز — رہ نہ خاموش کچھ تو کر باتیں

۲۰؍جولائی ۱۹۰۹ء

❋

ہر داغِ دل ہے گویا تاریخ میرے تن میں — جلوے ہیں دوستوں کی صورت کے اس چمن میں
شیریں سے کوئی پوچھے یہ جذبہائے پنہاں — طاقت کہاں سے آئی بازوئے کوہکن میں
لبیک کہہ کے دوڑے وابستگانِ الفت — آواز تھی یہ کس کی ناقوسِ برہمن میں
کچھ لوگ اجنبی سے رستہ بتا رہے ہیں — زنداں سے میں چلا ہوں اُجڑے ہوئے وطن میں
آیا ہے روز محشر اُٹھا ہوں قبر سے میں — کچھ خط ستم گروں کے رکھے ہوئے کفن میں
تعمیل حکمِ احباب اب ہے عزیز ورنہ — نیرنگیِ فلک سے کیا رنگ ہو سخن میں

۳؍اگست ۱۹۰۹ء

❋

ظلم کرتے ہیں یہ ظالم کہ دوا کرتے ہیں — چارہ سازوں سے یہ پوچھو تو کہ کیا کرتے ہیں
کان دھر کر کبھی سن آؤ کہانی دل کی — ہونٹ بیمارِ محبت کے ہلا کرتے ہیں
کیوں لرزتی ہے یہ زنداں کی عمارت دیکھوں — کیا وہ لاشوں کو اسیروں کی رہا کرتے ہیں
کیا کہوں آپ سے حالِ دلِ بیمار عزیز — وقت اب وہ ہے کہ دشمن بھی دعا کرتے ہیں

۲۸؍اگست ۱۹۰۹ء

❋

اب بدنصیب قابلِ گفتار بھی نہیں — وہ وقت ہے کہ پرسشِ بیمار بھی نہیں
ہے اک فریبِ ہمت و ناکامیِ خیال — مشکل جو کام ہے وہی دشوار بھی نہیں
دل میں ہجومِ یاس سے اے وائے بے کسی — گنجائشِ تصورِ دیدار بھی نہیں

وابستہ عمر سے ہے پرستاریِ صنم
تارِ نفس نہیں ہے تو زنار بھی نہیں

بس ہم ہیں اور ماتمِ تنہائیِ فراق
مدّت ہوئی کہ اب کوئی غمخوار بھی نہیں

بازیچہ گاہِ عشق میں اُس دل پہ حیف ہے
جس میں تصرّفِ نگہِ یار بھی نہیں

آخر اُنھیں بھی آج یہ کہنا پڑا عزیزؔ
تجھ سا ہلاکِ حسرتِ دیدار بھی نہیں

۷؍جنوری ۱۹۱۰ء

بس اب تو چین سے سو شور بھی جہاں میں نہیں
کہ سانس تک ترے بیمارِ ناتواں میں نہیں

دبے ہوؤں کو دباتی ہے اے زمینِ لحد
یہ جانتی ہے کہ دم جسمِ ناتواں میں نہیں

قفس میں جی نہیں لگتا ہے آہ پھر بھی مرا
یہ جانتا ہوں کہ تنکا بھی آشیاں میں نہیں

تمام تذکرۂ شوق اُن سے کہہ گزروں
کہاں سے لاؤں یہ وسعت مرے بیاں میں نہیں

اُجاڑ دے کوئی یا پھونک دے اُسے بجلی
یہ جانتا ہوں کہ رہنا اب آشیاں میں نہیں

اُڑا ہے رنگِ حنا جب سے اُن کے ہاتھوں کا
لہو کی بوند مرے قلبِ ناتواں میں نہیں

سکھا رہا ہے مکافاتِ عشق کے انداز
وگرنہ شیوۂ بیداد آسماں میں نہیں

شبِ فراق میں ہے جوشِ اضطراب کا قول
ذرا سا فرق زمین اور آسماں میں نہیں

نہ لے چلو مجھے اُن تک نہ جانے کیا میں کہوں
ہو اختیار یہ بات اب دل و زباں میں نہیں

خود اپنے دل سے مرا حال پوچھ لو سارا
مری زباں سے مزا میری داستاں میں نہیں

کریں گے آج سے ہم ضبط چاہے جو کچھ ہو
یہ کیا کہ لب پہ فغاں اور اثر فغاں میں نہیں

جنونِ شوق کا یہ مختصر سا قصّہ ہے
اب امتیاز رقیب اور رازداں میں نہیں

خیال کر کے خود اپنے کیے کو روتا ہوں
تباہیوں کے سوا کچھ مرے مکاں میں نہیں

عزیزؔ قابلِ عبرت ہے بے کسی اُس کی
کہ جس کا کوئی ٹھکانا کہیں جہاں میں نہیں

۲۰؍مارچ ۱۹۱۰ء

کبھی حوصلے دل کے ہم بھی نکالیں
اِدھر آؤ تم کو گلے سے لگالیں

بھلا ضبط کی بھی کوئی انتہا ہے
کہاں تک طبیعت کو اپنا سنبھالیں

یہ مانا کہ آزردہ تم سے ہمیں تھے — مگر آؤ اب ہم تمھیں کو منالیں
ابھی تربتِ دل پہ بیٹھے رہیں گے — ذرا اور کچھ دیر آنسو بہالیں
کہو بزمِ جمشید کے ساقیوں سے — فقیرِ درِ میکدہ کی دُعا لیں
عزیز اپنا زخمِ جگر تو دکھا دیں — مگر دونوں ہاتھوں سے وہ دل سنبھالیں

۲/جون ۱۹۱۰ء

✵

چارہ گر ہو گئے شامل انھیں بیماروں میں — چھڑ گئے کون سے قصے یہ دلِ افگاروں میں
ہیں مرے قتل کے بعد اہلِ شہادت مایوس — ہاتھ قاتل کے تھکے کس نہیں تلواروں میں
وادیِ حُسن کے ذرّات کو دیکھو تو بغور — دل بھی ہوگا کہیں اُن ٹوٹے ہوئے تاروں میں
تم سے کہتے تھے کہ باندھو نہ کمر میں یوں تیغ — سب کو اصرار ہے ہم بھی ہیں گنہگاروں میں
ساقیا کون سنے جا کے حدیثِ واعظ — قصۂ جام چھڑا ہے ترے میخواروں میں
داغِ دل شامِ جوانی میں مزا دیتے ہیں — ہے بہار اور ہی ان چھٹکے ہوئے تاروں میں
ہم نے مانا کہ زمانہ میں ستم گر ہو تمھیں — ایسی باتیں نہ کرو بیٹھ کے بیماروں میں
غور سے دیکھئے دیوانوں کے اُجڑے ہوئے گھر — کارنامے ہیں یہ جو نقش ہیں دیواروں میں
آج اُس کا بھی ہوا خاتمہ بالخیر عزیز — ایک دل رہ گیا تھا ساتھ کے بیماروں میں

۷/اپریل ۱۹۱۱ء

✵

کھلے تھے جس قدر گلہائے رنگیں صحنِ گلشن میں — زمیں گورِ غریباں کی لیے ہے اُن کو دامن میں
یہ کہہ کر لے لیا دل میرے سینے سے ستم گر نے — تعجب ہے کیا تھا اس کو زندہ دفن مدفن میں
خداوندا یہ کس نے آنکھ بھر کر اس کو دیکھا تھا — یہ کیسا زہر چھلکا ہے مریضِ عشق کی تن میں
مجسم نقشِ عبرت ہوں سراپا داغِ ہستی ہوں — مفصل دیکھ لو تاریخ دنیا کی مرے تن میں
بتا اے خالقِ ارض و سما کس کام آئے گی — مری ہستی کہ اک دھبا سا ہے دنیا کے دامن میں
اُلجھ کر رہ گیا نظروں میں رشتہ نظمِ عالم کا — بسر کی زندگی کی آخری شب ایسی الجھن میں

ثبوتِ بُت پرستی مل گیا خود نقشِ ہستی سے — رگیں اُبھری ہیں یا ہے رشتۂ زنار گردن میں
عزیزِ سر بزانو وہ زمانہ یاد ہے تجھ کو — پڑی تھیں چاندنی باہیں کسی کی تیری گردن میں

۲؍مارچ ۱۹۱۲ء

✵

جھیپتے کیوں ہو جو سرتابقدم دیکھتے ہیں — یہ کوئی اور نہیں ہے تمھیں ہم دیکھتے ہیں
ہم کو حیرت نے انھیں حُسن نے آئینہ کیا — وہ ہمیں دیکھتے ہیں اور انھیں ہم دیکھتے ہیں
درِ منعم پہ ہے مقصود گدائی کس کو — دل پہ حوصلۂ اہلِ کرم دیکھتے ہیں
دیر میں عمر بسر کیوں نہ کریں ہم زاہد — آستینوں میں نہاں جب کہ صنم دیکھتے ہیں
دم ہے آنکھوں میں نگاہیں ہیں مگر قاتل پر — بستۂ ذوقِ ستم، طرزِ ستم دیکھتے ہیں
سوزِ باطن کا اثر ضبط سے چھپتا ہے کہیں — شمع کو آبلہ سر تا بقدم دیکھتے ہیں
امتحاں گاہِ محبت میں یہ کون آئے گا — آج وہ تیغِ ستم کا دم و خم دیکھتے ہیں
حُسن خود بیں کا تلوّن نظر آتا ہے ہمیں — جب کبھی حاصلِ ہستی و عدم دیکھتے ہیں
آسماں جب کوئی بیداد نئی کرتا ہے — تجھ کو اے خانہ براندازِ ستم دیکھتے ہیں
واعظ اُن کو نہ کبھی خلد کا لالچ دینا — دل کے ہر زخم میں جو باغِ ارم دیکھتے ہیں
حشر کیا چیز ہے اور شورِ قیامت کیا ہے — ایسے فتنے وہ بہت زیرِ قدم دیکھتے ہیں
اس کا کیا ذکر کہ آئندہ تحمل نہ رہے — دیکھ سکتے ہیں جو آنکھوں سے ستم دیکھتے ہیں
حُسن و عشق ایک ہی جوہر نظر آتے ہیں ہمیں — آئینے میں جو کبھی شکل بہم دیکھتے ہیں
گھٹ کے نکلا ہے مری آہِ پریشاں کا دھواں — آج زلفوں میں وہ آرائشِ خم دیکھتے ہیں
مشکلیں ضبطِ محبت کی اُنھیں سے پوچھو — نزع میں جو مرا رکتا ہوا دم دیکھتے ہیں
یاد پھر آئی کوئی صحبتِ دیرینہ عزیزؔ — مجلسِ وعظ میں اب آپ کو کم دیکھتے ہیں

یکم؍اگست ۱۹۱۲ء

✵

چارہ گر چپ ہیں کیوں علاج کریں — کچھ تو اپنے کئے کی لاج[1] کریں

---

۱ گو یہ زبان عورتوں کے لیے مخصوص ہے لیکن چوں کہ یہ مطلع بے تکلف موزوں ہو گیا مصنف نے رہنے دیا ۱۲۔

اُن سے کس نے کہا تھا وہ مجھ کو
فردِ ہستی میں اندراج کریں

روز کھٹکا سا دل میں رہتا ہے
دیکھیے کیا وہ حکم آج کریں

فرصتِ زیست کم ہے کام بہت
کل جو کرنا ہے ہم کو آج کریں

چارہ گر بھی نہ کیا کریں گے یاد
کر سکیں جس قدر علاج کریں

سب اسی کی سی کہہ رہے ہیں عزیزؔ
کس سے ہم عرضِ احتیاج کریں

۲۷/اگست ۱۹۱۴ء

مصیبت تھی ہمارے ہی لیے کیوں
یہ مانا ہم جیے لیکن جیے کیوں

نہ آنا اور پھر الزام دینا
کہ اتنے بے اثر نالے کیے کیوں

پسِ خم پینے میں ہے کیا بزرگی
جو پینا ہے تو پھر چھپ کر پیے کیوں

جو دی تھی حُسن میں یہ دل فریبی
مجھے ہوش و حواس اتنے دیے کیوں

خیالِ جنبشِ مژگاں نہ رکھا
ہمارے زخم میں ٹانکے دیے کیوں

عزیزؔ الزام دیتا ہے مجھے ضبط
نہ تھی تاثیر تو نالے کیے کیوں

۱۳/دسمبر ۱۹۱۴ء

عشق نے روزِ ازل لکھوادیا تقدیر میں
موت تو جلد آئے گی نکلے گا دم تاخیر میں

حشر نے رازِ نگاہِ مست افشا کردیا
عالمِ کونین سب پیوست تھا اک تیر میں

اے فرشتو آسمانوں کی طنابیں کھینچ لو
آج اثر بھرنے کو ہیں ہم آہِ بے تاثیر میں

بعد میرے ناوکِ قاتل کی جب تشریح کی
ریشہ ریشہ دل کا تھا پیوست نوکِ تیر میں

ضبط کر آہوں کو اب رُکتا ہے دم بیمارِ غم
خونِ دل کی بُو ہے تیرے نالۂ شب گیر میں

جن کے دل کمزور ہیں اُن کو نہ دکھلانا کبھی
کھینچ تو لائے ہو تم اک چیز نوکِ تیر میں

رہتی دنیا تک رہی یہ بات میرے غم کے ساتھ
آپ آئے تو سرِ بالیں مگر تاخیر میں

روزِ روشن کردیا بیمارِ غم نے رات کو
جذب ہو کر رہ گئی شب نالۂ شب گیر میں

وہ اور ان کے ساتھ اک دنیا ہے پابندِ الم
عالمِ ہستی کے ذرّہ ذرّہ منتشر ہو جاؤ اب
وہ وہاں عالم مٹا دینے کا ساماں کر چکے
ہچکیوں کا تار ٹوٹا روح کو فرصت ملی
رات دن دیکھے ہیں آنکھوں نے کچھ ایسے حادثے

مرنے والے کیا تھا تیری آخری تحریر میں
پھونکتا ہوں صور اثر کا آہِ بے تاثیر میں
ہم ابھی تک ہیں فریبِ آہِ بے تاثیر میں
قیدیِ غم کیا رہے کے ٹوٹی ہوئی زنجیر میں
دل نہیں لگتا عزیزؔ اس خاک کی تعمیر میں

۲۰ر فروری ۱۹۱۷ء

✲

وہ شوخ، فتنہ ساز، کہیں بد گماں نہ ہو
واعظ تری زبان سے سنتا تو ذکر حور
ایسے سے خاک مہر و وفا کی اُمید ہو
کہنے کا قصد کچھ ہے نکلتا ہے منہ سے کچھ
گو نا تواں ہو ساتھ رہو سب کے تم عزیزؔ

ناصح ہمارے حال پہ تو مہرباں نہ ہو
اتنا خیال ہے کہ کوئی بد گماں نہ ہو
جس پر ہنوز راز محبت عیاں نہیں
کیوں نامہ بر سے دل مرا اب بد گماں نہ ہو
واماندہ مثلِ گردِ پسِ کارواں نہ ہو

۵ر دسمبر ۱۹۰۳ء

✲

ہجومِ بے کسی سے کوئی سرگرمِ فغاں کیوں ہو
ہلاکِ رشک ہوں میں دل کی غمخواری سے باز آیا
جفاؤ! امتحاں کا عشق میں جب لیک حاصل ہے
یہاں شوریدگی کو دھن کہ ہم سر کو وہیں پھوڑیں
نہ پوچھو دم کے رُکنے کا سبب تم نزع میں مجھ سے
ملے ہیں جب کہ دونو دل تو آخر شرم سے حاصل
جفاجو بھی تمھاری فتنہ پردازی سے ڈرتے ہیں
زمانے کے حوادث خود مری فطرت میں داخل ہیں
چلو جھگڑا مٹا ہم زندگی سے یوں بھی عاجز تھے

مذاقِ ضبط کامل ہو تو کہنے کو زباں کیوں ہو
تمھارا رازداں جو ہے وہ میرا رازداں کیوں ہو
ستم ہی کیوں نہ ہو بدنام نامِ امتحاں کیوں ہو
وہاں یہ ضد کہ یہ سر اور میرا آستاں کیوں ہو
کیا ہو زندگی بھر ضبط جس نے رائیگاں کیوں ہو
تکلف بر طرف ہے جب تو پردہ درمیاں کیوں ہو
نہ ہو خوفِ ستم تو دورِ دَورِ آسماں کیوں ہو
مصیبت دل کی کیا کم ہے بلائے آسماں کیوں ہو
یہ بے جا مہربانی کیا تم اتنے مہرباں کیوں ہو

زمانہ کی شکایت ہم کو کرنا نا مناسب ہے
کہ جب نامہرباں وہ ہے تو عالم مہرباں کیوں ہو

دمِ آخر مریضِ غم کی بالیں تک چلے آؤ
کسی کی عمر بھر کی جانفشانی رائیگاں کیوں ہو

نہیں کم سوگواری کے لیے خود حسرتیں اس کی
دلِ مردہ پہ میرے آ کے کوئی نوحہ خواں کیوں ہو

مریضِ غم کو اپنے ہاتھ سے تم زہر ہی دیدو
اک اُس کے دم سے عاجز اس قدر سارا جہاں کیوں ہو

عزیز اب تک ہوا ظاہر نہ یہ راز اہلِ دنیا پر
وہی چاروں طرف جب جلوہ گر ہو پھر نہاں کیوں ہو

۲۰ر مئی ۱۹۰۷ء

آپ جب آئیں تو مشکل مری آساں کیوں ہو
وقت آخر کوئی شرمندۂ احساں کیوں ہو

اک اُداسی پہ ہے موقوف مری دل چسپی
گھر ہی ویران ہے جب سیرِ بیاباں کیوں ہو

وائے دیوانگیِ شوق کہ پھر بھی نہیں چین
جانتا ہوں جو نکل جائے وہ ارماں کیوں ہو

وہ نہیں آئے تو بیمار کو سمجھائے یہ کون
مشکل آساں کوئی کردے گا ہراساں کیوں ہو

عقدۂ تنگیِ دل واہ ہو یہ مطلب ہے عزیز
ورنہ ذوقِ خلشِ ناوکِ مژگاں کیوں ہو

۲۲ر جون ۱۹۱۱ء

حال ہے غیر مرا سب کو بتاتے جاؤ
گھیرے جو بیٹھے ہیں ان کو تو اُٹھاتے جاؤ

تازہ کرتے چلو پھر گرمیِ ہنگامۂ طور
پھونک دو گھر کو مرے آگ لگاتے جاؤ

دیکھو انجام کہ آنکھوں میں بھر آئے آنسو
ظلم ہے یوں بھی کسی کو نہ ہنساتے جاؤ

وقت وہ ہے کہ میں کہتا ہوں طبیبوں سے عزیز
کچھ مرا حال تو تم مجھ کو بتاتے جاؤ

۱۰ر جنوری ۱۹۱۲ء

دلِ نازک کی قدر ہی کب کی
بات غصہ سے اُس نے کی جب کی

موت میری کھڑی ہے بالیں پر
منتظر تیرے جنبشِ لب کی

وقتِ نظارہ اُف رے حیرانی
میرے جانب نگاہ ہے سب کی

دل کبھی تھا ہمارے پہلو میں
یہ خدا جانے بات ہے کب کی

دیر و کعبہ میں فرق کیا ہے عزیزؔ
صرف پابندیاں ہیں مذہب کی

۴؍نومبر ۱۹۰۴ء

ساری خلقت حشر میں اپنی تماشائی ہوئی
داد خواہی کو گئے تھے اُلٹی رُسوائی ہوئی

آسماں سے بڑھ کے ہر ذرہ نے کی اس کے جفا
وہ زمیں جو تھی کسی ظالم کی ٹھکرائی ہوئی

بھولے جاتے ہیں مرے پہچاننے والے مجھے
جب سے اے نا آشنا تجھ سے شناسائی ہوئی

تنگیِ دل کا اسی سے کر لو اندازہ عزیزؔ
آہ دقت سے جو نکلی بھی تو گھبرائی ہوئی

۴؍جنوری ۱۹۰۵ء

ہنگامہ اِک لیے شبِ فرقت بھی آگئی
لو آگئی عزیزؔ قیامت بھی آگئی

دل سے تعلق اس کی نگاہوں کا کیا کہوں
لڑنا نظر کا تھا کہ طبیعت بھی آگئی

بے داد بھی وہ کی کہ تحمل نہ ہو سکا
آخر کو میرے لب پہ شکایت بھی آگئی

اے طولِ شام ہجر بس اب داد پاگیا
میں منتظر تھا صبح قیامت بھی آگئی

بدلے ہوئے ہیں دن ہی سے آثارِ دورِ چرخ
کیا دیکھتے ہو شام مصیبت بھی آگئی

تھا دل فریبیِ مہِ کنعاں کا کچھ خیال
پیشِ نگاہ آپ کی صورت بھی آگئی

تھا یہ خیال مجھ میں تغیر ہے اتنا کیوں
آئینہ لے کے آپ کی صورت بھی آگئی

کیوں چارہ ساز ایک نظر اُس کو دیکھ لوں
اب کیا ہے مجھ میں تھوڑی سی طاقت بھی آگئی

اے جانے والے گورِ غریباں کے ہوشیار
زیرِ قدم عزیزؔ کی تربت بھی آگئی

۲۹؍جولائی ۱۹۰۵ء

✲

آئینہ رکھ کے دیکھ تماشا کہیں جسے — تو ہی تو خود ہے وہ بھی کہ تجھ سا کہیں جسے

وہ اشک جلوہ زار تمنا کہیں جسے — اک خونِ دل کا قطرہ ہے دریا کہیں جسے

بیتابیِ تراوشِ خونابِ دل کا جوش — اتنا تو ہو تلاطمِ دریا کہیں جسے

درکار ہے وہ نغمۂ خوش وقتِ مے کشی — آوازِ سازِ قلقلِ مینا کہیں جسے

نظارہ سوزیِ رُخِ جاناں تو دیکھیے — اُس سے حذر ہے محوِ تماشا کہیں جسے

اے تیرِ ناز دل میں ہمارے لہو کہاں — ہے بھی تو وہ کہ خونِ تمنا کہیں جسے

اللہ رے تیرے نقشِ تلوّن کی شوخیاں — اک رنگ ہے اُسی کا یہ دُنیا کہیں جسے

اے حسنِ وقتِ مشقِ تصور تو دے ذرا — پھر وہ تجھے دکھاؤں کہ تجھ سا کہیں جسے

بالیں سے مسکرا کے تمھیں جب کہ اُٹھ گئے — اب اور کون ہے کہ ہم اپنا کہیں جسے

روزِ ازل ملا ہے ہر اک دل کو بیش و کم — وہ داغِ عشق نقشِ سویدا کہیں جسے

دے چشمِ معرفت میں نظارے کے واسطے — وہ نورِ بزمِ قدس کا پردا کہیں اسے

دیکھوں تو جذبِ حسرتِ دیدار وقتِ نزع — اے روح یوں نکل کہ تماشا کہیں جسے

اک شمع ہے سو وہ بھی اُٹھی جاتی ہے عزیز — دل سوز اور کون ہے اپنا کہیں جسے

۲۹؍جون ۱۹۰۶ء

✲

دلِ مضطر پہ کیوں گہری نظر کی — رُکی جاتی ہیں نبضیں چارہ گر کی

نہ رکھتے ہاتھ سے آئینہ دم بھر — مرے چہرے پہ تم نے کب نظر کی

بنی ہیں شہرِ آشوبِ تمنا — خمار آلودہ آنکھیں رات بھر کی

مجھے بے اختیار آتا ہے رونا — نہ پوچھو زندگی کیوں کر بسر کی

پشیماں ہو رہا ہوں بھیج کر خط — نظر ملتی نہیں ہے نامہ بر کی

کوئی ساتھی چھٹا جب قیدِ غم سے — درِ زنداں پہ حسرت سے نظر کی

نگاہِ واپسیں کشتۂ غم — طویل اِک داستاں بھی عمر بھر کی

۳؍جولائی ۱۹۰۶ء

✵

عمر گزری ہے بشغلِ خانہ ویرانی مجھے
کیا ہوا ہستی سے حاصل جز پشیمانی مجھے
اے حنائے دستِ قاتل دیکھ کر قسمت تری
رشک سے کرنا پڑا آخر لہو پانی مجھے
دم نہ لینے پایا تھا میں چھیڑ دی اک داستاں
قبر میں کیا خاک حاصل ہو تن آسانی مجھے
تنگیِ خلوت سے ہوتا تھا فشارِ آرزو
راس آئی غنچہِ دل کی پریشانی مجھے
ہاں ملالے دشت کو اے وسعتِ شوقِ جنوں
ہے بہت کم اپنے کاشانے کی ویرانی مجھے
دیکھنا میرا تری جانب عجب ہنگامہ تھا
کردیا تو نے تماشا گاہِ حیرانی مجھے
یارب ایسے رشک کا بھی کچھ ٹھکانا ہے کہیں
خود نہیں منظور اُس کے گھر کی دربانی مجھے
پھر تقاضا ہے کہ چلیے بزمِ جاناں میں عزیز
دیکھیے اب کیا دکھائے دل کی نادانی مجھے

۱۵ر جولائی ۱۹۰۶ء

✵

میرے رُونے پہ یہ ہنسی کیسی
اے ستم گر یہ دل لگی کیسی
کھل گئی پھر کوئی رگ دل کیا
دیدۂ خشک یہ نمی کیسی
ہوش ہے تجھ کو خاک کے پُتلے
یہ تمرد یہ سرکشی کیسی
تھا یہ اک امتحاں طبیعت کا
ورنہ ناصح سے دوستی کیسی
رو رہا ہوں اسی تصور میں
دی تھی یہ مجھ کو زندگی کیسی
اب تو اس در تک آگئے ہو عزیز
سنبھلو سنبھلو یہ بے خودی کیسی

۷ر اگست ۱۹۰۶ء

✵

دیتا ہے مجھ کو لطف ہمیشہ وصال کے
صدقے ہزار جان سے تیرے خیال کے
یہ شانِ حُسن اور یہ بیباکیاں کلیم
قائل ہیں ہم تو آپ کے طرزِ سوال کے

اب قدر ہو رہی ہے خوشا لذتِ مرض
پرساں ہیں وہ مریضِ محبت کے حال کے

ناصح تری نصیحتِ بے جا بجا سہی
کیوں کر دکھاؤں تجھ کو کلیجہ نکال کے

ٹکڑے پڑے ہیں آئینۂ دل کے جا بجا
چلئے گا راستے میں ذرا دیکھ بھال کے

اب مرگِ ناگہاں کی دعا مانگتا ہوں میں
مل جائیں گے اسی سے پتے میرے حال کے

بیر بطی کلام ہوئی پردہ در عزیز
رُسوا ہوا میں بات بھی منھ سے نکال کے

۲۹/اگست ۱۹۰۶ء

آج دیکھوں کششِ غم ہو کدھر سے پہلے
دل سے درد اُٹھتا ہے پہلے کہ جگر سے پہلے

سایۂ زلف نہیں آئینۂ عارض میں
وقت یہ وہ ہے جو ہوتا ہے سحر سے پہلے

ناتواں شوقِ شہادت کے دکھائیں جذبے
باندھیے آپ تو تلوار کمر سے پہلے

پھر سنوں شوق سے میں تیری نصیحت ناصح
دیکھ ہر کام مرا میری نظر سے پہلے

آنکھ ملتے ہی دگر گوں جو ہوا حال عزیز
ہائے آگاہ نہ تھا تیری نظر سے پہلے

۶/اکتوبر ۱۹۰۶ء

مشکلیں طولِ مرض کی تم تو آساں کر چکے
زہر کھالیں قصد یہ بیمارِ ہجراں کر چکے

شکوۂ بیداد خوئے بے نیازی کیا کریں
دل کو نذرِ امتحانِ نازِ جاناں کر چکے

دیکھ کر ہم کو یو نہیں ہنستا رہا کوئی اگر
اے جنوں ہم بخیۂ چاکِ گریباں کر چکے

اب یہ قسمت ہے مریضِ غم کی اچھا ہو نہ ہو
چارہ گر تو جس قدر ممکن تھا درماں کر چکے

خاک میں بھی اب لگے ہاتھوں ملاتے جائیے
مشکلیں تو جس قدر تھیں آپ آساں کر چکے

چارہ گر جی کھول کر اپنے نکالیں حوصلے
دل کو ہم آمادۂ تکلیفِ درماں کر چکے

زندگی تا ختم میعادِ اسیری اور ہم
بس رہائی کی اُمید اے اہلِ زنداں کر چکے

رشک کے قابل ہے اُس وحشی کی حالت اے عزیز
چاک وہ خود ہاتھ سے جس کا گریباں کر چکے

۲۴/جنوری ۱۹۰۷ء

✲

حسرتِ گریہ جو تو رہ جائے گی / شرحِ لفظ آرزو و رہ جائے گی
بھول جاؤں گا میں سب قصے مگر / شام فرقت یاد تو رہ جائے گی
خام کہلائے گا سوزِ عاشقی / بوند بھی گر اے لہو رہ جائے گی
اُٹھ کے پہلو سے چلے جائیں گے وہ / دل سے ہم سے گفتگو رہ جائے گی
ہے یہ وقتِ امتحانِ چشم تر / رونے والے آبرو رہ جائے گی
کیا ہی مہکیں گے ترے بستر کے پھول / کچھ پسینے کی جو بو رہ جائے گی
عمر بھر ڈھونڈھیں گے جب بھی اے عزیز / آرزوئے جستجو رہ جائے گی

۱۱؍اپریل ۱۹۰۷ء

✲

ادھر دیکھ نیچی نظر کرنے والے / یہی تیر ہیں دل میں گھر کرنے والے
طلسماتِ دنیا میں کیا تو نے دیکھا / بتا جا ہمیں اے سفر کرنے والے
الٰہی سلامت رہیں تاقیامت / عداوت سے مجھ پر نظر کرنے والے
دورنگیِ عالم سے ہیں خوب واقف / ترے در پہ شام و سحر کرنے والے
یہی دل میں باقی ہیں دو ایک قطرے / مری خشک آنکھوں کے تر کرنے والے
شبِ ہجر اس وہم نے مار ڈالا / یہ نالے نہیں ہیں اثر کرنے والے
اب اس بے کسی سے تو بہتر ہے مرجا / ارے زندگانی بسر کرنے والے
کسی بات پر مسکراتے چلے ہیں / مری خاک پر سے گذر کرنے والے
شبِ ہجر رو تیرہ بختی پر اپنی / بسر کر ہی دیں گے بسر کرنے والے
بتا ہاتھ کیوں تیرے تھرا رہے ہیں / رفوئے شگافِ جگر کرنے والے
عزیز آج مایوس ہو کر چلے ہیں / مداوائے زخمِ جگر کرنے والے

۲۴؍مئی ۱۹۰۷ء

❋

دل ترا کیوں کہا کیا میں نے — ہائے افسوس کیا کیا میں نے
یادِ ایامِ عالمِ وحشت — کچھ نہ تھا غم کہ کیا کیا میں نے
زندگی کٹ گئی کسی صورت — یہ نہ پوچھو کہ کیا کیا میں نے
ہائے مجبوریاں محبت کی — چاہئے جو نہ تھا کیا میں نے
اس کو دیکھا تو آنکھ بھر کے عزیز — یہ نہ سوچا کہ کیا کیا میں نے

۱۰ر جون ۱۹۰۷ء

❋

اک جہاں روئے گا بال اُن کے پریشاں ہوں گے — ہائے اک روز مرے گھر میں یہ ساماں ہوں گے
دیکھیے سخت ہے یہ مرحلۂ قتل مرا — آپ بے رحم سہی پھر بھی پشیماں ہوں گے
اور آثار عیاں چہرۂ بیمار سے ہیں — جائیے جائیے اب آپ پریشاں ہوں گے
سعی بے جا ہے مداوائے مریضانِ فراق — چارہ سازوں سے یہ کہہ دو کہ پشیماں ہوں گے
ہم کو تو فکر ہے مر جائیں کسی صورت سے — کون ہیں وہ کہ جنھیں زیست کے ارماں ہوں گے
سچ ہے جس دن میں مروں گا تو قیامت ہوگی — میرے گھر میں نئی دنیا نئے ساماں ہوں گے
آگئی ایڑیوں تک زلف رسا ان کی عزیز — اب تو وہ قابلِ طولِ شبِ ہجراں ہوں گے

۲ر ستمبر ۱۹۰۷ء

❋

سونے والوں کو لحد کے وہ جگا کے اُٹھے — جب اُٹھے وہ تو کوئی حشر اٹھا کے اُٹھے
دے گئے گورِ غریباں پہ وہ یہ دادِ وفا — ناز بردار مرے ناز اُٹھا کے اُٹھے
کیوں اُٹھے انجمنِ ناز سے زندہ صد حیف — سرگزشت اپنی تجھے جب نہ سنا کے اُٹھے
کیا کہیں آگ دہکتی تھی کہاں کی دل میں — نالہ کھینچا تو زمانہ کو جلا کے اُٹھے

گرمی حسن پہ شعلوں کی یہ آتش خیزی — مہندی کیا مل کے اٹھے آگ لگا کے اُٹھے
کرچکے حیرتِ حسن آپ کی ہم زیبِ خیال — ایک آئینہ تصور میں بنا کے اُٹھے
تھا تغیّر مری حالت میں کچھ اس طرح عزیز — آج بیداد سے وہ ہاتھ اُٹھا کے اُٹھے

۳؍جنوری ۱۹۰۸ء

✻

بیماریِ فراق بھی اک نام کر گئی — افسانہ رہ گیا شبِ فرقت گذر گئی
گویا زمانے بھر کی طبیعت ٹھہر گئی — بیمار کے گلے سے دوا کچھ اتر گئی
ناسورِ دل دکھا تو دیا چارہ ساز کو — ڈرتا ہوں اب کہ دور تک اس کی نظر گئی
جب رو کے میری قبر سے احباب اُٹھ گئے — افسوس ایسے وقت میں تم کو خبر گئی
اشکوں سے اُس نے گن لیے ناسورہائے دل — دیکھے کوئی کہاں سے کہاں تک نظر گئی
دیکھا نگاہِ ناز کو نشتر لیے ہوئے — رگ رگ تنِ ضعیف پہ میرے اُبھر گئی
شرما کے اُس نے مجھ کو گلے سے لگالیا — مایوسیِ نگاہ عجب کام کر گئی
ہمت تمام پست ہوئی رنگ اُڑ گیا — زخمِ جگر پہ جب نظر چارہ گر گئی
آنکھیں لگی ہیں چھت سے زباں بند ہے عزیز — وہ ابتدائے عشق کی صورت کدھر گئی

۱۰؍فروری ۱۹۰۸ء

✻

سامنے آئینہ تھا مستی تھی — اُن پر اک شان خود پرستی تھی
مجھ کو کعبہ میں بھی ہمیشہ شیخ — یادِ ایامِ بُت پرستی تھی
صرف دل ہی نہیں جلا میرا — ذرّہ ذرّہ میں اُس کے بستی تھی
کیوں زلیخا تری عدالت میں — حُسن کی جنس ایسی سستی تھی
سوجھتا تھا نہ انتظار میں کچھ — دیکھنے کو نگہ ترستی تھی
دیکھنے ہم گئے تھے قبر عزیز — ہائے کیا بے کسی برستی تھی

۱۰؍اپریل ۱۹۰۸ء

✻

تم سا بھی کوئی دکھا ہی دیں گے
اب پردۂ دل اُٹھا ہی دیں گے

یوں آئے رُلا کے جانے والے
جیسے کہ ہمیں ہنسا ہی دیں گے

تاچند چھپائیں حالِ دل ہم
اک روز انھیں سنا ہی دیں گے

دیکھیں گے وہ جب عزیزؔ کی قبر
ہے نقشِ وفا مٹا ہی دیں گے

۱۰ر اگست ۱۹۰۸ء

✻

کرو تدبیر کہ کم کردے محبت تیری
جب میں جانوں کہ مرے دل پہ ہے قدرت تیری

اب کھلی زخمِ جگر مجھ پہ حقیقت تیری
سطر بخیہ میں پڑھی جب کہ حکایت تیری

کچھ تو بیمار کی ڈوبی ہوئی نبضیں اُبھریں
تھی یہ اے نالۂ جاں کاہ کرامت تیری

کیا کہوں کیا نہ کہوں ہستیِ موہوم کا راز
نزع میں پوچھتے ہیں کیا ہے حقیقت تیری

الحذر اُن کا تحمل بھی کرامت ہے کوئی
دل میں جو لوگ چھپا لیتے ہیں الفت تیری

کردے بیمار وداعِ نفسِ بازپسیں
کون کرتا ہے بھلا آ کے عیادت تیری

اے جوانی جھلک اس طرح دکھائی تو نے
کہ نگاہوں میں مری پھرتی ہے صورت تیری

نالہ کھینچا جو ترے جذبِ تصور میں کبھی
کھنچ گئی ہر در و دیوار پہ صورت تیری

نزع میں پرتوِ رخ ڈال کہ روشن ہو نگاہ
اب دکھائی نہیں دیتی مجھے صورت تیری

دل کے داغوں کی نمائش مجھے منظور نہیں
بات رکھتا ہوں میں خورشیدِ قیامت تیری

دل ہی میں اپنے لیے جا اسے اے کشتۂ غم
کس کا دل ہے کہ سنے آ کے وصیت تیری

حشر کی دھوپ میں اس وقت چلے تر دامن
سر پہ جب سایہ فگن ہو گئی رحمت تیری

وہم سے عقل، محبت نے ترقی پائی
اپنی پرچھائیں میں پاتا ہوں شباہت تیری

نالہ کش کون سا آیا ہے میانِ محشر،
سانس رُکنے لگی اے صورِ قیامت تیری

جب کفن لائے ہیں بیمارِ محبت کے لیے
صبح اُس وقت ہوئی ہے شبِ فرقت تیری

تا قیامت سحرِ وصل نہ بھولے گا عزیزؔ
قہر تھیں قہر وہ باتیں دمِ رخصت تیری

۲۰ر اگست ۱۹۰۸ء

❋

گھبرا کے سب نے ان کی طرف اک نگاہ کی — کس دل شکستہ نے دمِ آخر یہ آہ کی
منظور ہے جو سیر سپید و سیاہ کی — گردش کو دیکھ دیدۂ عبرت نگاہ کی
موسیٰ کی بے خودی نے وہ نقشہ مٹا دیا — تصویر کھینچ چلی تھی تری جلوہ گاہ کی
لکھا ملا مسودۂ شامِ ہجر میں — یارب دراز عمر ہو زلفِ سیاہ کی
افشائے راز گریۂ یعقوب ہو گیا — تصویر آنسوؤں میں تھی نورِ نگاہ کی
پروانے کو ملی ہے مکافاتِ عاشقی — پر کیا جلے کہ جل گئیں فردیں گناہ کی
آزادگانِ عشق کی گستاخیاں تو دیکھ — خود داد مانگتے ہیں تجھی سے گناہ کی
کہتی ہے روح آئی ہیں جتنی کہ ہچکیاں — اُتنی ہی میں نے ٹھوکریں کھائی ہیں راہ کی

۱۰/جولائی ۱۹۰۹ء

❋

کیا کہوں کیا یہ شامِ فرقت ہے — شرحِ ہنگامۂ قیامت ہے
مان لوں کیوں میں قول ناصح کا — یہ بھی کوئی حدیث و آیت ہے
لاکھ آبادیاں نثار اس پر — اللہ اللہ یہ کس کی تربت ہے
اپنے دل سے بھی بدگماں ہوں میں — کیا بُری چیز یہ محبت ہے
آپ نے تیغ کس لیے روکی — جان تو آپ کی امانت ہے
آیئے دیکھ لیجیے مجھ کو — اب جو دم ہے بہت غنیمت ہے
زندگی ہم سے ناتوانوں کی — یہ بھی اک عشق کی کرامت ہے
جس طرح چاہو در سے اٹھوا دو — ایک بے کس کی کیا حقیقت ہے
کون سنتا ہے دردِ عشق عزیزؔ — کس سے یہ شکوۂ و شکایت ہے

۲۹/نومبر ۱۹۰۹ء

✻

جہاں میں کاش پیدا ہی نہ ہوتے
نہ بن پڑتی ہے ہنستے اور نہ روتے

شبِ فرقت اسی حسرت میں گزری
ہمیں بھی نیند آتی ہم بھی سوتے

اگر بڑھتی ہے میرے دل کی دھڑکن
وہ چونک اُٹھتے ہیں شب کو سوتے سوتے

کہیں یہ راز کیا اے ہنسنے والے
اگر جیتے تو کچھ دن اور روتے

بہت جھگڑے رہے فرقت کی شب تک
نہ دنیا تھی نہ ہم تھے صبح ہوتے

یہ کس نے خواب میں جلوہ دکھایا
یونہیں ہم رہ گئے سوتے کے سوتے

عزیزؔ اب ضبط سے بھی کام لے کچھ
ارے مر جائے گا کیا روتے روتے

۲۸/اپریل ۱۹۱۰ء

✻

کوئی اس بے کسی سے روتا ہے
عشق کے دل میں درد ہوتا ہے

جس کے مرنے کی ہو خوشی تم کو
ایسی میّت پہ کون روتا ہے

کوئی عالم میں سو نہیں سکتا
بے خبر یوں کبھی کوئی سوتا ہے

سانس بیمار کی اُکھڑتی ہے
آج قصّہ تمام ہوتا ہے

اس قدر کیوں تڑپ رہے ہو عزیزؔ
کیا کلیجے میں درد ہوتا ہے

۱۷/جون ۱۹۱۰ء

یہ مشورہ بہم اٹھے ہیں چارہ جو کرتے
اب اس مریض کو اچھا تھا قبلہ رو کرتے

زبان رک گئی آخر سحر کے ہوتے ہی
تمام رات کٹی دل سے گفتگو کرتے

کفن کو باندھے ہوئے سر سے آئیں ہیں ورنہ
ہم اور آپ سے اس طرح گفتگو کرتے

سوادِ شہر خموشاں کا دیکھئے منظر
سنا نہ ہو جو خموشی کو گفتگو کرتے

ہوئی ہے دیر کہ کچھ ہوش بخیہ گر کو نہیں
کہو کہ زخم جگر میں یہ کیا رفو کرتے

یقین تھا کہ طنابیں زمیں کی کھنچ جاتیں
بحدِ سعی اگر اس کی جستجو کرتے

یہ کیا خبر تھی کہ لکنت پسند ہے ورنہ
زبانِ حضرتِ موسیٰ میں گفتگو کرتے

یہ کہہ کہ ہم سے دلِ خوں شدہ لیا اُس نے
کہو تو کیا یہ بھلا بوند بھر لہو کرتے

حریصِ لذتِ غم تھے اگر نہ کچھ ہوتا
تو نوحہ خوانیِ ناکامیِ عدو کرتے

اُمیدِ صحت زخمِ جگر ہمیں کب تھی
کہ بند و بست پئے بخیہ و رفو کرتے

اگر کہیں وہ دم واپسیں چلے آتے
ہم ایک سانس میں تفصیل آرزو کرتے

تمام روح کی لذت اسی پہ تھی موقوف
کہ زندگی میں کبھی تم سے گفتگو کرتے

جواب حضرتِ ناصح کو ہم بھی کچھ دیتے
جو گفتگو کے طریقے سے گفتگو کرتے

پہنچ کے حشر کے میداں میں ہول کیوں ہے عزیز
ابھی تو پہلی ہی منزل ہے جستجو کرتے

۳۰ رجولائی ۱۹۱۰ء

یہ کیا بتاؤں زخم میں کیسی خراش ہے
سُن لیجیے گا آج جگر پاش پاش ہے

اللہ ری بھیڑ شہر میں رستہ نہیں کہیں
دیکھیں تو آؤ چل کے ذرا کس کی لاش ہے

کیوں نقشِ سیمیا کو سمجھتا ہے معتبر
دم بھر میں رازِ ہستیِ موہوم فاش ہے

وہ دل ازل میں جس کو ملے داغِ سینہ سوز
سرکارِ عشق میں وہ مرا خواجہ تاش ہے

اک روز جستجو تھی کسی اور کی ہمیں / یا آج ہے وہ دن کہ خود اپنی تلاش ہے
کیوں چارہ ساز ضبط کروں اب میں یا نہیں / نالہ رکا ہے جب سے جگر میں خراش ہے
ہیں تیرے ساتھ ساتھ زمانے کی قوتیں / کیوں اے نگاہِ شوق یہ کس کی تلاش ہے
تابوت کو عزیزؔ کے آہستہ لے چلو / ٹکڑے سب اِس شہیدِ محبت کی لاش ہے

۲۴؍ فروری ۱۹۱۱ء

کون ہیں وہ جو لگی دل کی بجھا ہی دیں گے / کچھ نہ ہوگا تو اُنھیں دل سے دعا ہی دیں گے
وہم آتا ہے جو افلاک جھکے پڑتے ہیں / ان کے ماتھے سے ہم افشاں کو چھڑا ہی دیں گے
منحصر وقت پہ ہے گورِ غریباں کی سحر / جب نقاب اُٹھیں گے وہ سب کو جگا ہی دیں گے
روح بیمارِ محبت کی یہ کہہ کر نکلی / یہ قیامت کا ہے وقت ان کو جگا ہی دیں گے
زندگی ہے تو دکھا دیں گے فروغِ اُردو / ہم بھی اس بزم میں اک شمع جلا ہی دیں گے

۱۷؍ اپریل ۱۹۱۱ء

کیوں ہوس آپ سے ملنے کی ہے دن رات مجھے / خود میسر نہیں جب اپنی ملاقات مجھے
یہ درازیِ شبِ غم کی یہ بلاؤں کا ہجوم / اُس پر اندھیرا کہ آنکھوں میں کٹی رات مجھے
بند ہوتی ہے زباں مجھ سے نہ پوچھو کچھ حال / اب کسی سے نہیں کہنا ہے کوئی بات مجھے
واعظوں کی یہ حکومت یہ گھٹاؤں کا ہجوم / اب کی دیوانہ بنا دے گی یہ برسات مجھے
سرِ منبر جنھیں واعظ نے کہا لا مذہب / نظر آتے ہیں وہی مست مئے ذات مجھے
وقت رونے کا معیّن نہ کرا اے غیرتِ عشق / سخت دشوار ہے پابندیِ اوقات مجھے
دل پریشان ہے ہر وقت یہ عالم ہے عزیزؔ / نظر آتے ہیں کچھ اُڑتے ہوئے ذرّات مجھے

۱۲؍ مئی ۱۹۱۱ء

یہ مانا کہ فرصت بہت تم کو کم ہے ٹھہر جاؤ دم بھر ابھی دم میں دم ہے
وہ سویا کئے اور میں کہتا رہا اٹھو اٹھ کے باتیں کرو رات کم ہے
ہے سر تا قدم سادہ لوحی کا نقشہ غنیمت زمانے میں ناصح کا دم ہے
بتاؤ مرے دل پہ تم ہاتھ رکھ کر یہ نالہ رُکا ہے کہ سینہ میں دم ہے
یہ کس در پہ تو غیر کو لے چلا ہے ارے پیر گردوں ابھی مجھ میں دم ہے
وہ کم مایگی کے مجھے دیں گے طعنے ارے درد تو آج کیوں دل میں کم ہے
کبھی دل میں میرے چمک سی اُٹھی تھی اب اک آبلہ آج سر تا قدم ہے
فراغت ملے بت کدہ سے تو جاؤں بہت دن سے قصدِ طوافِ حرم ہے
جسے صبحِ محشر کا سمجھے ہو تارا وہ اک قطرۂ اشکِ بیمار غم ہے

سنبھل کر عزیزؔ اُس سے آنکھیں ملانا
نگاہوں میں زہر آبِ تیغِ ستم ہے

۲۲؍جون ۱۹۱۱ء

دیکھتے تھے آپ اور عبرت کبھی ایسی نہ تھی اب جو ہے بیمار کی حالت کبھی ایسی نہ تھی
چاندنی ہے آپ ہیں اور پھول دامن میں بھرے آج ہے جیسی مری تربت کبھی ایسی نہ تھی
دیکھ کر وہ نزع کی تکلیف ان کا التفات زندگی بھر میں ہمیں راحت کبھی ایسی نہ تھی
اٹھ گئے تیمار داروں سے یہ کہہ کر دم شناس نبضِ بیمارِ شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی
بخش دے اے ضبطِ جرم نالہ بے اختیار تھی کھٹک اک درد کی شدت کبھی ایسی نہ تھی
کچھ تو ہے بیٹھے ہوئے ہیں واعظانِ شہر سب ورنہ میخانہ میں تو صحبت کبھی ایسی نہ تھی
آگ دل کی کچھ دبا دی تو نے داغِ شعلہ خوار ورنہ ہم میں ضبط کی طاقت کبھی ایسی نہ تھی
سوچتا ہوں اس کو دیکھوں اور لرز جاتا ہوں پھر میرے دل میں ضعف کی شدت کبھی ایسی نہ تھی
مر گیا بیمارِ صبحِ ہجر اتنا کہہ کہ بس تجھ سے امید اے شبِ فرقت کبھی ایسی نہ تھی
داغِ دل ہے اک نشانِ حسرتِ مردہ عزیزؔ دید کے قابل کوئی تربت کبھی ایسی نہ تھی

۱۲؍اکتوبر ۱۹۱۱ء

❋

کام دنیا میں بہت کرنا ہے / قبل مرنے کے ہمیں مرنا ہے
آئیے نزع کا ہنگام ہے اب / مشورہ آپ سے کچھ کرنا ہے
دل نے یہ کہہ کے کہیں چھوڑا ساتھ / ہم کو کچھ کام یہاں کرنا ہے
قتل کرنے میں تکلف نہ کرو / آخر اک روز ہمیں مرنا ہے
تم سے اک روز کریں گے تقریر / اپنی باتوں میں اثر بھرنا ہے
تم کو دکھلائیں گے دل کی تصویر / جا بجا رنگ ابھی بھرنا ہے
رُوک لو گریۂ خونیں کو عزیزؔ / دل کا ناسور ابھی بھرنا ہے

۲۷/دسمبر ۱۹۱۱ء

❋

رہنے دو کہ ہے قابلِ عبرت مرا گھر بھی / آئے گا کبھی تو کوئی سیاح اِدھر بھی
واعظ ہے صراط آپ کی گو بال سے باریک / دیکھا ہے کبھی جادۂ ناسور جگر بھی
کھولا جو نہیں دستِ حنابستہ انھوں نے / ٹھہرا ہے ابھی اپنی جگہ خونِ جگر بھی
کچھ دور وہ ہمراہ جنازے کے چلیں گے / کیا دیر ہے بیمارِ محبت کہیں مر بھی
کونین ہے بیتاب ترے جلوۂ رُخ سے / ہے ایک تماشا جو ادھر بھی ہے اُدھر بھی
مرکز کی کشش روح کو دیتی ہے یہ تعلیم / اس طرح نکل جا کہ نہ ہو تن کو خبر بھی
مانا کہ کسی سے نہ کروں گا میں کوئی بات / چھپتی ہے کہیں چاہنے والے کی نظر بھی
بیٹھا ہے جھکائے ہوئے سر دیر سے کوئی / بیمارِ شبِ غم کوئی کروٹ تو ادھر بھی
ہے یہ بھی خبر جذبۂ تاثیر کے مالک / محتاج ہے تیرا کوئی مایوسِ اثر بھی
دینا نہ عزیزؔ آنکھ کو گردشِ دمِ آخر / بیٹھے ہیں سرہانے ترے اربابِ نظر بھی

۲۷/اپریل ۱۹۱۲ء

✲

کب اکیلے اس جہاں سے ہم گئے
لے کے اپنے ساتھ اِک عالم گئے

در کھلا جب کربلائے عشق کا
اہل دل کرتے ہوئے ماتم گئے

بن گیا کوئی جگر اور کوئی دل
اشک خونیں کے جو قطرے جم گئے

پھوٹ نکلا زہر سارے جسم میں
جب کبھی آنسو ہمارے تھم گئے

پھر کسی نے بھی نہ پوچھا اے عزیزؔ
قبر تک سب صاحبِ ماتم گئے

۲۸ر ستمبر ۱۹۱۲ء

✲

تاچند دل خراش یہ قصے سنا چکے
بس بس عزیزؔ اب تو انھیں بھی رُلا چکے

کہتی ہے روحِ نزع میں رستہ دکھا چکے
جاتے ہیں ہم خود آپ وہاں وہ تو آ چکے

اے بے کسی کی موت ادھر بھی گزر ہو اب
ہم سب سے آج رسمِ محبت اٹھا چکے

اب آئے ہیں اُلٹ کے نقاب آپ سامنے
جب رونے والے ہجر میں آنکھیں بہا چکے

کیوں جستجوئے منزلِ پایانِ عشق ہے
ان کی بھی کچھ خبر ہے کہ جو لوگ جا چکے

پوچھو اُنھیں سے میری نگاہوں کا کچھ اثر
یٰسین جو مجھے سرِ بالیں سنا چکے

فارغ ہوئے ہیں زینتِ گیسو سے آپ کب
احباب جب عزیزؔ کی میّت اُٹھا چکے

۲ر دسمبر ۱۹۱۲ء

✲

وہ دل ایسا کون دل ہے کہ جسے قرار آئے
یہ جوانی اُف جوانی کہ خدا کو پیار آئے

کہیں وعدہ بھی کریں وہ کہ ذرا قرار آئے
کہیں ختم زندگی ہو شبِ انتظار آئے

دل بے قرار میرا ہے خزانہ بجلیوں کا
جو خدا ہی کردے ساکن تو اُسے قرار آئے

انھیں کیا غرض کہ سنتے وہ غریب کی صدائیں
یہ جنونِ بے خودی تھا کہ جو ہم پکار آئے

یہ خزاں کی فصل کیا ہے فقط ان کی پردہ داری
وہ نقاب اگر الٹ دیں تو ابھی بہار آئے

یہ وصیت آخری ہے اسے سن لیں سب اَحِبّا
کوئی دل کا ذکر کرتا نہ سر مزار آئے

ادبِ فنا سکھانا اُسے آنے والی دنیا
کوئی بندۂ محبت جو سر مزار آئے

ترے وعدے کی حقیقت کو ہمیں سمجھ رہے ہیں
وہ حریصِ زندگی ہے جسے اعتبار آئے

مجھے کیا غرض عزیزاب کہ چمن نے گل کھلائے
جو چراغِ قبر ہنس دے تو مری بہار آئے

۴؍مارچ ۱۹۱۳ء

انتہائے عشق ہو، یوں عشق میں کامل بنو
خاک ہو کر بھی نشانِ سرحدِ منزل بنو

میرے شکووں پر یہ کہنا رحم کے قابل بنو
مدّعا یہ ہے کہ اپنے حال سے غافل بنو

غرق ہو کر رول لو موتی خود اپنے واسطے
ڈوب کر اُبھرو تو اوروں کے لیے ساحل بنو

انجمن کیسی، تم اپنی ذات سے ہو انجمن
گوشۂ خلوت میں بھی بیٹھو تو اک محفل بنو

حسنِ خود بیں معجزاتِ عشق کا قائل نہیں
قطرہ ہائے اشک خونیں جمع ہو کر دل بنو

ساتھ آزادی کے خودداری بھی رہنا چاہیے
بحر بے پایاں، کبھی لب خشکی ساحل بنو

علم کا دورہ لہو کے ساتھ رگ رگ میں رہے
جوہر قابل اگر ہو قوّتِ عامل بنو

شرم سے تم کو سمٹنا ہے تو سمٹو حسن سے
دل میں بن جاؤں سویدا، پتلیوں میں تل بنو

ربطِ باطن کیا، سنو تفصیل اس اجمال کی
ہم سراپا درد ہوں اور تم سراپا دل بنو

جلنے والو ! تا بہ اِمکاں ضبطِ سوزِ غم کرو
آگ جب بھڑکے چراغِ سرحدِ منزل بنو
کچھ دنوں بیٹھو سرِ قبرِ عزیزِ بے نوا
خانقاہوں میں بہت دشوار ہے کامل بنو

۱۰ر جنوری ۱۹۲۰ء

✵

کوئی ارماں نکل نہیں سکتا — دل کا عالم بدل نہیں سکتا
نفس کہتا ہے بارِ عصیاں سے — اب تو لنگر سنبھل نہیں سکتا
اہلِ عرفاں کا ظرفِ عالی ہے — دل کا چشمہ اُبل نہیں سکتا
آنے والے کہاں تک اب تاخیر — موت کا وقت ٹل نہیں سکتا
دل نکل آئے ، سینہ شق ہوجائے — دل کا کانٹا نکل نہیں سکتا
سعیِ اخفائے راز نے مارا — جلتا رہتا ہوں جل نہیں سکتا

سر سے پا تک اِک آبلہ ہوں عزیزؔ
اب تو کروٹ بدل نہیں سکتا

۱۵ر فروری ۱۹۲۰ء

✵

کرنا ہے اپنے حال میں یہ شب بسر مجھے
اب آکے دیکھے گا قریبِ سحر مجھے
کہہ دو کہ میں ہوں اور ہے اک عالم وصال
مُردہ سمجھ رہے ہیں یہ کیوں نوحہ گر مجھے
جلووں کو اُن کے شوق کا پیدا کروں حجاب
دیکھوں تو کیا دکھائے یہ ذوقِ نظر مجھے

شاہد ترے وجود پہ ہے میری بے خودی
میں ہوں اگر تو کیوں نہیں اپنی خبر مجھے

یہ کم نگاہیاں تری ساقی رہیں گی یاد
ساغر ملا ہے بزم میں سب کو، مگر مجھے ؟

اک آہ بھر کے اب نہ کہوں گا کسی سے کچھ
کرنا ہے آج قصۂ غم مختصر مجھے

کوئی قصور میری نظر کا نہیں عزیزؔ
مجبور کر رہی ہے کسی کی نظر مجھے

۱۰؍ مئی ۱۹۲۰ء

✲

تضاوت طبیعت میں ہے رات دن کا
وہ عالم نہیں اب دلِ مطمئن کا

کسی وقت رونے سے فرصت نہیں ہے
یہی مشغلہ رہ گیا رات دن کا

نہ گھبراؤ ٹوٹے گی مہر خموشی
ابھی منتظر ہوں قیامت کے دن کا

وہ دنیا کے ہوش و حواس اب کہاں ہیں
اثر عُمر کا ہے تقاضا ہے سِن کا

بہار آئی پھولوں کاعالم نہ پوچھو
جوانی ہے ان کی، زمانہ ہے اِن کا

سرِ طور جو برق بن کر گرا تھا
وہ میرے نشیمن کا تھا ایک تنکا

ابھی منھ چھپائے ہوئے جو گئے ہیں
عزیزؔ وفا کیش کشتہ ہے اِن کا

۱۵؍ دسمبر ۱۹۱۰ء

✲

ترے فراق سے مری ہستی تباہ ہے
میرا وجود میرے لیے اک گناہ ہے
وجہِ خلش ہے نقشِ سویدا سے آشکار
کانٹا چُبھا ہے یا یہ کسی کی نگاہ ہے
کھولی ہے کس نے زلف کہ میری نگاہ میں
عالم تمام موجہ دودِ سیاہ ہے
کنعاں میں جس کے حسن کی پھیلی تھی روشنی
زنداں کا چاند آج وہ نورِ نگاہ ہے
ہے بس حقیقتِ دلِ زخمی اسی قدر
گل دستہ بہار، فریبِ نگاہ ہے
دنیا کو جانتا ہوں میں اک فردِ معصیت
جب ہر وجود اس میں سراپا گناہ ہے
آساں نہیں ہے بُت کدۂ دہر سے عُبور
ایک ایک گام پر کوئی بُت سنگِ راہ ہے
گنجائش ایک تل میں کہاں تیرے حسن کی
نظارۂ جمال سے قاصر نگاہ ہے
لکھ دو زمانے بھر کی خطائیں مرے یہاں
آخر تو فرد میرے عمل کی سیاہ ہے
یہ منھ چھپائے جاتے ہیں جو سوئے میکدہ
مجھ سے بھی ان جناب سے کچھ رسم و راہ ہے
باتوں سے میری ہوگا وہی کچھ اثر پذیر
جو آشنائے زمزمۂ خانقاہ ہے

دل میں ہے کچھ نظر سے ٹپکتا ہے اور کچھ
کتنی زمانہ ساز تمھاری نگاہ ہے

ایوانِ رحمتِ ازلی تک تو جا ذرا
آواز آرہی ہے ، کوئی داد خواہ ہے ؟

میں کیا ہوں ،ایک شعلۂ جاں سوزِ عشق ہوں
دل کیا ہے، اِک نشانۂ تیر نگاہ ہے

قبرِ عزیز دیکھ کے کہتے ہیں اہلِ دل
یہ تو کسی شہید کی آرام گاہ ہے

گل پوش بلبلوں نے کیا مشہدِ عزیز
یہ عافیت نصیب شہیدِ نگاہ ہے

۲۲رجنوری ۱۹۲۱ء

✻

جام خالی جہاں نظر آیا میری آنکھوں میں خوں اتر آیا
وہ بہت کم کسی نے دیکھا ہے مجھ کو جو کچھ یہاں نظر آیا
جھک گئے آسمان سجدے میں کون یہ اپنے بام پر آیا
کانپ اُٹھا چرخ ،ہل گئی دنیا وہ جہاں اپنی بات پر آیا
اُس نے پوچھا مزاج کیسا ہے دل جو اُمڈا ہوا تھا بھر آیا
جب کبھی اُس نے کی نظر مجھ پر ایک چھالا نیا اُبھر آیا
تیری جانب سے ہوشیار گیا اپنی جانب سے بے خبر آیا
جب کیا قصدِ ضبط آہ عزیز
دل میں چھالا سا اِک اُبھر آیا

۲۰رفروری ۱۹۲۱ء

اچھا ہوا کہ رنگِ طبیعت بدل گیا
بہ بہ کے آنسوؤں میں کلیجا نکل گیا

آئے نہ وقتِ نزع، مرا دم نکل گیا
کہنے کو بات رہ گئی، اور وقت ٹل گیا

دل ہے نہ اب وہ دل کی خلش مطمئن ہوں میں
کانٹا کھٹک رہا تھا وہ آخر نکل گیا

یہ سوچتا ہوں رنگِ طبیعت کو دیکھ کر
یہ میں بدل گیا کہ زمانہ بدل گیا

تاثیر انقلاب تھی میری نگاہ میں
جس پر نظر جمائی وہ نقشہ بدل گیا

اُمیدوار وصل کو اُن کا جوابِ صاف
اک تیر تھا جو توڑ کے پہلو نکل گیا

جو عمر بھر گھٹا ہو، بھلا اس کی موت کیا
بس یہ ہوا کہ منہ سے دھواں سا نکل گیا

کٹتی نہ آج رات، وہ اُلجھن تھی شام کو
رونا جو آگیا تو ذرا جی سنبھل گیا

دیکھے تو کوئی نالۂ شب گیر کا اثر
تھا جو نفس وہ درد کے سانچے میں ڈھل گیا

تاثیرِ وحشت آج ہوا میں ہے کیا کروں
تھی جیب پر نگاہ کہ دامن نکل گیا

اب ہم کسی سے ملنے کے قابل نہیں عزیزؔ
مدت ہوئی کہ رنگِ طبیعت بدل گیا

۱۸؍ فروری ۱۹۲۱ء

آنکھوں سے خونِ دل کا جو قطرہ نکل گیا
مضمونِ زندگی کی وہ سُرخی بدل گیا
دنیا ہے چند خاک کے پُتلوں کی ایک بزم
جب مل گئے یہ خاک میں نقشہ بدل گیا
دل چاہتا تھا جاؤں تری جلوہ گاہ تک
تو لے تھے پر کہ شہپر پرواز جل گیا
کیا رو رہا تھا شامِ جوانی کے واسطے
پیری تھی جس کی صبح وہ دن بھی تو ڈھل گیا
مدّت کے بعد مشقِ تصور سے یہ ہوا
دُھندلا سا ایک نقش اُبھر کر نکل گیا
کب تک رہے گی روح عذابِ الیم میں
یہ سادہ لوح ناصح بے مہر کھل گیا
ساقی نگاہِ تشنہ ے کش کا دیکھ اثر
شیشے درک رہے تھے کہ ساغر اُبل گیا
روشن ہوا عزیزؔ سے پھر لکھنؤ کا نام
مدّت سے جو چراغ بجھا تھا وہ جل گیا

پائے طلب بھی شل ہوئے راہ میں جست خیز سے
منزل عشق طے ہوئی، جبہہ سجدہ ریز سے
بندِ نقاب کھول دے، ختم بھی ہو یہ مرحلہ
میرا تو دم اُلٹ گیا، شورش رست خیز سے
دل میں جراحت آنکھ تر، سر میں دھمک جگر میں درد
رازِ حیات کھل گیا، عشقِ نتیجہ خیز سے

ناز نے تیغ تیز کی، غمزے نے خوں بہا دیا
دل کو نجات مل گئی کش مکشِ ستیز سے

رنگِ ہوا بدل گیا، زلف یہ کس نے کھول دی
قلب و دماغ بس گئے، موجۂ مشک بیز سے

ساقیِ ناز آفریں، تیری صدا کے میں نثار
خون رگوں میں بڑھ گیا، زمزمہ بریز سے

روکشِ ماہتاب ہے، دامنِ گوہریں مرا
ٹوٹے ہیں تارے رات بھر، دیدۂ اشک ریز سے

طبقۂ دل اُلٹ گیا، دورِ جہاں پلٹ گیا
دیکھ لیا جہاں عزیز، اُس نے نگاہِ تیز سے

۵ر مارچ ۱۹۲۱ء

✵

شاید عزیز آہ میں تاثیر ہوگئی
دنیا تمام درد کی تصویر ہوگئی

لوحِ حیات آپ کی تقریر ہوگئی
جو بات کی نوشتۂ تقدیر ہوگئی

جتنی مصیبتیں تھیں وہ لکھ دیں مرے یہاں
بس ختم سعیِ کاتبِ تقدیر ہوگئی

دل کو جلا کے دولتِ جاوید پا گیا
اتنی سی خاک مایۂ اکسیر ہوگئی

اے سعیِ نا مراد! بتا کیا جواب دوں
تقدیر پوچھتی ہے کہ تدبیر ہوگئی؟

کہیے کہ اب میں اپنی حقیقت کو کیا کہوں
جو سانس لی وہ آپ کی تصویر ہو گئی

ہاتھوں سے میرے دامنِ رحمت چھٹا تو لے
ہاں ہاں! یہ جانتا ہوں کہ تقصیر ہو گئی

تھا نزع میں بھی سلسلۂ قیدِ غم وہی
اینٹھی جو رگ وہ حلقۂ زنجیر ہو گئی

آزاد ہوں قیودِ جہنم سے دوستو!
میری حیات ہی مجھے تعزیر ہو گئی

دل کو ہے اعتراف، زباں معترف نہ ہو
ایمان کی تو یہ ہے کہ تقصیر ہو گئی

اب دل پہ یادگار سعیدہ[1] کا داغ ہے
پیوندِ خاک چاند سی تصویر ہو گئی

ہستی کی شرح، نزع میں کرتا مگر عزیزؔ
دو ہچکیوں میں ختم یہ تفسیر ہو گئی

۲۸/اگست ۱۹۲۱ء

جب سے ترا خیال ہم آغوش ہو گیا
میں خود ہی اپنے دل سے فراموش ہو گیا

تھی عشق میں حقیقتِ ہستی بس اس قدر
اِک آہ بھر کے آتشِ خاموش ہو گیا

جب سے خیالِ وعدہ وفائی ہوا اُسے
اُس دن سے اور زود فراموش ہو گیا

اِک بے کسی سی چہرۂ صبحِ وطن پہ تھی
یہ رنگ دیکھ کر میں کفن پوش ہو گیا

رختِ کثیفِ جسم بہت بار تھا مجھے
احساں اجل کا، آج سُبک دوش ہو گیا

اب تم ہو اور تجلیِ برقِ نگاہ ہے
ہشیار! اہلِ بزم، میں بے ہوش ہو گیا

---

[1] دخترِ ہفت سالہ مصنف

طغیان ناز نے مجھے طوفاں بنا دیا
ہر قطرہ خون کا ہمہ تن جوش ہو گیا

صرف امتحانِ دیدۂ بینا کے واسطے
وہ پردۂ مجاز میں روپوش ہوگیا

کچھ اور بڑھ گئے مرے عصیاں کے حوصلے
تو جتنا جرم بخش و خطا پوش ہو گیا

خاتونِ مصر! اب مہِ کنعاں کے واسطے
زنداں تمام ہالۂ آغوش ہو گیا

تھا اس سے قبل بزم میں ہنگامہ گرم کن
سمجھا میں رازِ دہر تو خاموش ہو گیا

بجلی چمک رہی تھی بہ تمہیدِ امتحاں
پردہ سرک رہا تھا کہ بے ہوش ہو گیا

کیا دیکھتا ہوں کون یہ بیٹھا ہے میرے پاس
میں اپنے ہوش میں ہوں کہ بے ہوش ہوگیا

کہتا بہت کچھ اہلِ سخن سے، مگر عزیز
محفل کا رنگ دیکھ کے خاموش ہو گیا

۱۶/دسمبر۱۹۲۱ء

✻

نہ پوچھو مجھ سے کب تھا اور کہاں تھا آشیاں میرا
تجلی سر بہ سجدہ تھی مکاں تھا لا مکاں میرا

نظر محدود، دنیا تنگ، باز آیا میں جینے سے
یہی ہے گر زمیں میری، یہی گر آسماں میرا

بلندی عرش کی دبتی ہے دل کی شانِ رفعت سے
مگر تم نے ملایا خاک میں یہ آسماں میرا

یہ کس نے پاؤں رکھا سرحدِ گورِ غریباں میں
زمیں سے پھر اُبھر آیا مزارِ بے نشاں میرا

رہا ہو کر قفس سے اب لیے جاتا ہے کس جانب
تجھے کچھ ہوش ہے اے دل! نشیمن تھا کہاں میرا
مثالِ نقشِ پا واماندگی، آثارِ غفلت ہیں
مدد اے جذبۂ دل بڑھ چلا ہے کارواں میرا
بجز روح القدس دے کون داد اس نغمہ سنجی کی
نہ کوئی ہم سخن میرا، نہ کوئی ہم زباں میرا
قفس سے خاک اُڑی میری، نشیمن سے اُڑے تنکے
ہوا میں ڈھونڈھتا پھرتا ہے مجھ کو آشیاں میرا
عزیز آخر کہاں تک، نزع کی بھی ایک مدت ہے
زباں ہوتی ہے بند، اب ختم ہوتا ہے بیاں میرا

۱۰/اپریل ۱۹۲۲ء

✵

جو گیا تقدیر کا شاکی گیا چار و ناچار آپ سے راضی گیا
کون اب تصویر کھینچے گا تری وہ دلِ صورت گرِ معنی گیا
رو رہے ہیں کس لیے یہ نوحہ گر مرنے والا مر گیا یا جی گیا
میں تھا پیاسا اور ساقی تھا جواد اب خدا معلوم کتنی پی گیا
خاک کے ذرّوں میں طوفاں ہے عزیز
مر کے کوئی جذبۂ فطری گیا!

۲۱/اپریل ۱۹۲۲ء

✵

کر دیا انکار اُزل میں جس سے ہر دل گیر نے
وہ مری قسمت میں لکھا کاتبِ تقدیر نے

دیکھتی ہی رہ گئی تاثیر جذب مرکزی
کر دیا پیوند خاک اِس خاکِ دامن گیر نے

موت سے پہلے لکھا تھا میں نے اُن کو ایک خط
کردیا ہنگامہ اُس حسرت بھری تحریر نے

کوہ کن سے ہجر کی راتیں نہ جب کاٹی گئیں
صبح کردی عشق کی دنیا میں جوئے شیر نے

صفحۂ دنیا کے اس جانب نہ آیا کچھ نظر
کس قدر دھوکا دیا اس نیم رُخ تصویر نے

عالم فانی و باقی کو دکھایا ہے فقط
اک مری تصویر نے اک آپ کی تصویر نے

آپ کچھ سمجھے مری ہستی کو، میں سمجھا کچھ اور
خواب کو اُلجھا دیا اس کثرتِ تعبیر نے

دونوں ہاتھ اُس نے ملا کر اس طرح انگڑائی لی
مار ڈالا کھنچ کے دوہری باڑھ کی شمشیر نے

قوّتِ ابداع ہے ہر شعر میں میرے عزیزؔ
فیض پہنچایا مجھے شیراز اور کشمیر نے

۱۲/ اگست ۱۹۲۲ء

✵

رخصت اَے صبر! آس ٹوٹ گئی کُھل گیا راز بات پھوٹ گئی
ہچکیاں نزع کی بتاتی ہیں ہر کڑی سلسلے کی ٹوٹ گئی
نہ ملا سنگِ آستاں تیرا ہائے تقدیر میری پھوٹ گئی
اب تحیر ہے رات دن مجھ کو عادتِ آہ و نالہ چھوٹ گئی
لاکھ پردوں میں تم چھپے پھر بھی حسنِ پنہاں کی بات پھوٹ گئی
نخلِ اُمید کیا پھلے گا عزیزؔ
ایک اک شاخ اس کی ٹوٹ گئی

۱۵/ نومبر ۱۹۲۲ء

✲

راز ہی ایسا ہے کوئی راز داں ملتا نہیں
ہوں تنِ تنہا شریکِ امتحاں ملتا نہیں

اِس طرف سجدوں کا اک محشر جبینوں میں بپا
اُس طرف یہ قہر، سنگ آستاں ملتا نہیں

منزلِ ہستی میں اک یوسف کی تھی مجھ کو تلاش
اب جو دیکھا، کارواں کا کارواں ملتا نہیں

زورِ وحدت تھا کہ کثرت جذب ہو کر رہ گئی
تو ہی تو ہے، بزم ہستی کا نشاں ملتا نہیں

ذرّے ذرّے پر لگی ہے مہر، کیا سمجھے کوئی
راز تو لاکھوں ہیں، لیکن رازداں ملتا نہیں

ہم صفیرانِ قفس، میری جگہ خالی رہے
ہوں میں گم کردہ نشیمن، آشیاں ملتا نہیں

یادگار میلِ منزل رہ گئے ہیں چند داغ
کاروانِ عمر رفتہ کا نشاں ملتا نہیں

میں وہ دریا ہوں جسے طوفان نے تعلیم دی
مجھ تلاطم حاصلِ عمرِ رواں ملتا نہیں

برق بن کر اُڑ گئے تنکے نشیمن کے عزیز
بجلیاں ٹوٹیں نہ جب تک آشیاں ملتا نہیں

۲ر دسمبر ۱۹۲۲ء

✲

تجھے ہر چند ذوقِ جستجو ہے — خودی تیری حجاب آرزو ہے
چمک اے جلوۂ نادید دم بھر — ہر اک ذرے کو تیری جستجو ہے
نشیمن میں رہیں آزاد کیوں کر — چمن تو خود اسیر رنگ و بو ہے

بساطِ دہر سے دھوکا نہ کھانا کہ یہ دامِ فریبِ آرزو ہے
حرارت عشق کی کرنا نہ تھی ضبط پسینا یہ نہیں، دل کا لہو ہے
عزیزؔ افسردہ ہوں طرزِ سخن سے
بہت عامی مذاقِ لکھنؤ ہے

۹؍ فروری ۱۹۲۳ء

✲

کچھ صلہ دے، رحم کر اس محنتِ برباد پر
بڑھ کے بوسہ دیدے شیریں تیشۂ فرہاد پر
یاد ہے پہلے پہل بجلی گرانا یاد ہے
آپ کی جب مہربانی تھی دلِ ناشاد پر
عشق میں ہر ہر قدم پر موت تھی خضرِ طریق
منزلیں پُر ہول اور اُفتاد تھی اُفتاد پر
خود فراموشی کی لذّت سے ابھی واقف نہیں
حضرتِ زاہد جو بھولے ہیں خدا کی یاد پر
جس لب و لہجہ سے کہنا چاہیے دردِ فراق
ختم ہے وہ عندلیبِ آشیاں برباد پر
یہ قرارِ بزمِ گیتی یہ سکونِ کائنات
منحصر ہے صرف ضبطِ طاقتِ فریاد پر
میں تو ہستی کو سمجھتا ہوں سراسر اک گناہ
پاک دامانی کا دعویٰ ہو تو کس بنیاد پر
باعثِ صد جوش ہوتی ہے شکایت بھی عزیزؔ
مسکرا دیتے ہیں جب وہ شکوۂ بیداد پر

۲۴؍ نومبر ۱۹۲۳ء

٭

مرے بعد انتہائے عشق کی تاثیر دیکھیں گے
تمھارے دیکھنے والے مری تصویر دیکھیں گے

کلیم اندازۂ بے ربطیِ تقریر دیکھیں گے
جوابِ صاف لوحِ طور پر تحریر دیکھیں گے

طلسمِ غم کی بنیادیں پڑیں گی نالۂ دل سے
فضا کے ذرّے ذرّے میں نئی تعمیر دیکھیں گے

چمن کی سیر سے مقصود تھی دل بستگی اپنی
خبر کیا تھی کہ ہر غنچے کو ہم دل گیر دیکھیں گے

ذرا جلنے تو دو دل کو یہ قرآنِ محبت ہے
اسی کی خاک میں کونین کی تفسیر دیکھیں گے

یہ مانا کاتبِ اعمال لکھ لیں گے مرے قصّے
مگر کچھ حالِ دل ناقابلِ تحریر دیکھیں گے

نظر آئیں گے ہم کو قید میں سامانِ آزادی
رگوں سے تن کو جب وابستہ زنجیر دیکھیں گے

زمیں شق ہو، فلک ٹوٹے، پہاڑ آپس میں ٹکرائیں
مگر ہم آج زورِ نالۂ شب گیر دیکھیں گے

نثار اس دل نوازی کے لگائی ہے گرہ ایسی
کہ ناممکن کشادِ عقدۂ تقدیر دیکھیں گے

چڑھائے ہے تجلّی تیوریاں، جانتے تو ہیں موسےٰ
جبینِ طور پر اپنا خطِ تقدیر دیکھیں گے

اُنھیں پھر قدر ہوگی اپنے حُسنِ روز افزوں کی
اگر وہ سلسلے سے میری ہر تصویر دیکھیں گے

دمِ اُکھڑے، پار ہوں، رو کے رہیں تا چند دریا کو
عزیز اب کھینچ کر اک نالۂ شب گیر دیکھیں گے

۲۵؍نومبر ۱۹۲۳ء

٭

پہلے کچھ قدر نہ کی عشق کے بیماروں کی
سرنگوں بیٹھے ہیں اب صف میں عزاداروں کی

بے خبر عشق کے آثارِ قدیمہ نہ مٹا
جوش کھاتا ہے لہو نیو میں دیواروں کی

کیا ہیں یہ ہستیِ کونین کے دونوں صفحے
ایک فہرست فقط اُن کے طلبگاروں کی

دفن ہے کیا دلِ بیتاب کا ذرّہ کوئی
جنبشیں ہم کو بتاتی ہیں یہ کہساروں کی

ذرّے ذرّے کو بنادے گی کسی دن مشرق
مہر افروز تجلّی ترے رخساروں کی

ڈبڈبا آئیں کسی مستِ طرب کی آنکھیں
حالت آخرکو نہ دیکھی گئی بیماروں کی

آ، کہ سامانِ تجلّی کی کمی پوری ہو
بزم آراستہ ہے چھٹکے ہوئے تاروں کی

اپنے انداز کو رحمت نہ سنور کر دیکھا
آئینہ بن گئیں شکلیں جو گنہ گاروں کی

عہد گل، سبزۂ نو خیز، نہالانِ چمن
داستانیں ہیں فقط تازہ گرفتاروں کی

عشق سرگشتہ رہا کشتۂ صد موجِ خرام
کٹ گئی عمر یونہی چھاؤں میں تلواروں کی

یوں نہ دیکھو کہ اُنھیں پھر نہ کوئی دیکھ سکے
دیکھ تو لے کبھی صورت کوئی بیماروں کی

میں تو میں، کاہشِ غم ہے وہ بُری چیز عزیزؔ
شکل دیکھی نہیں جاتی، مرے غم خواروں کی

۱۴ر ستمبر ۱۹۲۳ء

✵

جب سے مستغنی کیا دل کی صفائی نے مجھے
دیتے ہیں تعلیم خود بینی یہ آئینے مجھے
میں اور آدابِ عبودیت بجا لاتا بھلا
کردیا پابند آئینِ خدائی نے مجھے
اپنی قوت سے کیا ملکِ سخن زیرِ نگیں
فتح اِس بازو نے دی اور اس کلائی نے مجھے
شش جہت آئینۂ حیرت بنے میرے لیے
کردیا خود بیں کسی کی خود نمائی نے مجھے
میری صورت دیکھتے ہیں صبح اُٹھ کر اہلِ دل
کردیا آئینہ اس دل کی صفائی نے مجھے
اک کھٹک صبحِ ازل سے تھی برابر اے عزیزؔ
مار ڈالا دردِ دل کی دیر پائی نے مجھے

۱۸ر مئی ۱۹۲۴ء

✵

ساقیِ مست پاس ہے، جلوۂ ماہتاب ہے
بادۂ تندو تیز ہے، شیشۂ پُر گلاب ہے
بادہ کشی کی رات ہے، جمع ہے سازِ سلطنت
سر پہ ہے نورِ ماہتاب ،سامنے ماہتاب ہے
بارِ گراں سے ہو سُبک، خلوتیِ حریمِ قدس
قیدِ حیات سے نکل، بزم میں باریاب ہے
حالِ عزیزؔ بادہ کش، کوٹریوں سے پوچھ لو
رندِ ہزار شیوہ ہے، بندۂ بو تراب ہے

۱۵ر جون ۱۹۲۴ء

٭

آغاز میں جو دل کو خوفِ مآل ہوتا
میں سر فراز ہو کر کیوں پا ئمال ہوتا
کاش اختیار وقتِ اظہارِ حال ہوتا
اپنی زبان ہوتی، اپنا خیال ہوتا
دل کو اگر بناتے آئینۂ محبت
حاضر جواب ہوتا، صورت سوال ہوتا
غالب اگر نہ ہوتا وحدت کا رنگ اتنا
ہر فرد اس جہاں میں کیا بے مثال ہوتا
اے حسن و عشق تم میں اُس وقت صلح ہوتی
دونوں طبیعتوں میں جب اعتدال ہوتا
تربت پہ وہ کھڑے ہیں، ہم ہیں کہ محوِ غفلت
اے کاش عہدِ ماضی ،اس وقت حال ہوتا
اچھا کیا نہ آئے تم نزع میں سرہانے
جینا تو خیر جینا_ مرنا محال ہوتا
اخلاق کا عزیزؔ اب نام و نشاں نہیں ہے
کیا اور اس سے زائد قحط الرجال ہوتا

۲۰رجولائی ۱۹۲۴ء

٭

کون پھر اُس کے سوا موجود ہے	جب وُہی شاید،وہی مشہود ہے
دیکھنا اس کی طرف بے سود ہے	رنگِ رخسار آفتاب آلود ہے
تاب کس کو داستانِ دل سنے	حرف حرفِ عشق خوں آلود ہے
ایک ایک ذرّے پہ عبرت کی نظر	مدعائے ہستیِ بے بود ہے
انحصار سر زمینِ کعبہ کیا	ایک اک ذرہ یہاں مسجود ہے

ظلم اتنے، انتہا جس کی نہیں — پھر بھی اس سے دل مرا خوشنود ہے
حُسن کیا ہے؟ شعلہ پُر پیچ و خم — عشق کیا ہے ؟ ایک موجِ دود ہے
محفلِ دنیاے فانی رات دن — زمزمہ سنجِ ہُوالمو جُود ہے
خاکِ اربابِ وفا سے محترز ! — دیکھ لے دامن غبار آلود ہے
سانس کا باقی ہے جب تک سلسلہ — عافیت دل کے لیے مفقود ہے
تو جو مل جائے تو پھر کیا چاہیے — اور کیا تیرے سوا مقصود ہے
دل خلیلِ امتحاں گاہِ وفا — سوزشِ دل آتشِ نمرود ہے
دل نہ ہو جب تک کسی کا داغ داغ — بارگاہِ عشق میں مردود ہے
ننگ ہے ملنا ترا کیا قبلِ موت — خلقتِ دنیا مگر بے سود ہے

کشتۂ صد تیغِ ناکامی عزیزؔ
شکر ہے، حاسد نہیں محسود ہے

۲۵رجولائی ۱۹۲۴ء

شب آخر، ہم بھی آخر، دیکھیے کب تک وہ آتے ہیں
بصارت گھٹتی جاتی ہے، چراغ اب جھلملاتے ہیں
تلاطم دل میں برپا ہے، قدم تھرائے جاتے ہیں
حریمِ ناز کا پہلے پہل پردہ اُٹھاتے ہیں
ثبات اپنا دکھایا شمع نے گو تیری محفل میں
مگر دیکھا تو شعلے کے قدم تھرآئے جاتے ہیں
کسی کی انجمن میں جبر پر کیا اختیار اپنا
یہ عالم ہے کہ دل کے ساتھ ہم بھی بیٹھے جاتے ہیں
مری کمزوریوں سے یہ جسارت ہے زمانے کی
قدم ہٹتے ہیں جب پیچھے، حوادث بڑھتے آتے ہیں
سمجھتا ہے دلِ بے تاب یہ بجلی چمکتی ہے
وہ رہ رہ کر حریمِ ناز کا پردہ اُٹھاتے ہیں

غبار اُٹھتا ہے، بھر دیتے ہیں جوشِ بندگی اتنا
زمیں گردوں کو ٹھکراتی ہے، جب ہم سر جھکاتے ہیں

مری ہستی ذرا دکھلا اُنھیں آئینِ خودداری
مجھے بھی دیکھنا ہے تجھ کو وہ کیوں کر مٹاتے ہیں

ہوا سجدوں کے قابل اپنا آئینِ عبودیت
بنائے کعبہ پڑتی ہے جہاں ہم سر جھکاتے ہیں

ازل کے روز اے فراشِ قدرت کہہ دیا ہوتا
زمیں پیدا نہیں کرتے صفِ ماتم بچھاتے ہیں

شبِ غم منحصر گریے پہ ہے اختر شماری بھی
جب آنسو ضبط کرتا ہوں، ستارے ڈوب جاتے ہیں

تمھاری حسرتِ تعمیر پر اے خاک کے پُتلو!
شکستہ مرقد اب تک مقبروں میں مسکراتے ہیں

دلِ ویراں کو دیکھو، آسمانِ حسن کے تارو!
بتاؤ کس طرح اُجڑی ہوئی بستی بساتے ہیں

سلامِ آخری آئندگانِ رفتنی تم پر
مبارک تم کو یہ سامانِ ہستی ہم تو جاتے ہیں

اُنھیں کی وہ حیا پرور نگاہیں کیا مری جانب
مقابل ہے فقط آئینہ اور شرمائے جاتے ہیں

عزیزِ محترم کو اُن کی محفل خوب راس آئی
نکالے جاتے ہیں روز اور وہیں پھر پائے جاتے ہیں

۱۹۲۴ء

کیوں نہ ہو شوق ترے در پہ جبیں سائی کا
اس میں جوہر ہے مری آئینہ سیمائی کا

طور کشتہ ہے اسی نازِ خود آرائی کا
برق کی لہر ہے نقشہ تری انگڑائی کا

عشق اک تبصرہ ہے حُسن کی رعنائی پر
حُسن اک فلسفہ ہے عشق کی رسوائی کا

آج اک خاک کا ذرّہ بھی نہیں باقی ہے
دلِ برباد یہ حاصل ہے خود آرائی کا

یادِ ایام کہ تھی لب پہ مرے مہرِ سکوت
اب تو ماتم ہے بپا دل میں شکیبائی کا

موج در موج رواں بادۂ سرجوشِ شباب
عالمِ کیف ہے عالم تری انگڑائی کا

حسرت ویاس کا انبوہ ، مگر میں بے کس
ایسے مجمع میں یہ عالم مری تنہائی کا

تیرگی شامِ لحد کی ہے بھیانک لیکن
ہے یہ اُترا ہوا جامہ شبِ تنہائی کا

جزر و مد حسن کے دریا میں نظر آتا ہے
قابلِ دید ہے عالم تری انگڑائی کا

تیرے دیدار سے محروم رہیں جب آنکھیں
کوئی مصرف ہی نہیں پھر مری بینائی کا

عالمِ گورِ غریباں کا یہ غم ناک سکوت
ایک نمونہ ہے مرے دل کی شکیبائی کا

نیند اُن کی اگر اُڑ جائے تو کچھ دور نہیں
سوگیا جاگنے والا شبِ تنہائی کا

شعر دل کش ہو اگر صفحۂ کاغذ پہ عزیزؔ
اِک مُرقع ہے کمالِ سخن آرائی کا

۸ر دسمبر ۱۹۲۴ء

✲

آنکھ جھپکائی جہاں حُسنِ خود آرائی نے
جھک کے اِک سجدہ کیا چشمِ تماشائی نے

جب کیا دورِ مے آغاز خود آرائی نے
بڑھ کے اک دائرہ کھینچا تری انگڑائی نے

کردیا نشہ دوبالا تری انگڑائی نے
جام پر جام پیے چشمِ تماشائی نے

نہ بدلنا تھا نہ بدلا دلِ بے تاب کا رنگ
چرخ کھائے ہیں بہت گنبدِ مینائی نے

حشر میں جلوہ گہِ صبحِ ازل یاد آئی
مجھ کو گستاخ کیا تیری شناسائی نے

پردۂ برق میں اُو چھپ کے سنورنے والے
دور سے بھانپ لیا چشمِ تماشائی نے

سُرمہ آلود نگہِ ظالم مظلوم نما
بند کردی ہیں زبانیں تری گویائی نے

نشہ حُسنِ جوانی تھا خود اک چیز، مگر
بجلیاں اور گرائیں تری انگڑائی نے

ظلمتِ زلفِ سیہ تاب الٰہی توبہ
بھیس کس حُسن سے بدلا شبِ تنہائی نے

عشق بے برگ و نوا کو ہمہ تن زخم کیا
نگہِ ناز تری حوصلہ افزائی نے

جلوۂ رُخ سے منوّر تھا شبستانِ جمال
شمعیں دو اور جلا دیں تری انگڑائی نے

پھر بھی حسرت ہے کہ ہوتا میں کوئی نقشِ سکوت
گوکہ انسان بنایا مجھے گویائی نے

سر سے پا تک میری ہستی تھی تجلی کا ظہور
سب سے بیگانہ کیا اپنی شناسائی نے

عشق کو طاقتِ پرواز پہ تھا ناز بہت
خوب پھینکی ہے کمند آپ کی انگڑائی نے

دل کو اَے حُسن کی محفل میں بچانے والے
توڑ ڈالے گئے ہیں ایسے بہت آئینے

سجدۂ عام سے ہوتی ہے کوئی شے مسجود
کعبہ اُس در کو کیا میری جبیں سائی نے
روند ڈالا ہے ستاروں کی بھری محفل کو
پائے پُر آبلہ کی بادیہ پیمائی نے
اس تجاہل سے وہ بیگانہ روش اچھے تھے
ناشناس ان کو بنایا ہے شناسائی نے
سانس کیا لے گا کوئی کشتۂ اندازِ خمار
توڑ دیں دل کی رگیں آپ کی انگڑائی نے
کردیا ایک صنم خانۂ عصیاں آباد
بُت تراشے ہیں یہاں تک مُری گویائی نے
کردیا بزمِ کواکب کو نمودِ بے بود
دلِ پُر داغ تری انجمن آرائی نے
نہ ہوئی سعی ہماری کوئی مقبول عزیزؔ
کردیا خونِ دل اُمیدِ پذیرائی نے

جنوری ۱۹۲۶ء

جلایا کیسی ہم دردی سے دل سوزِ محبت میں
تصرف کا تھا کیا حق مجھ کو قدرت کی امانت میں
کہیں خورشیدِ محشر اشک خوں بن کر نہ گر جائے
چھڑی ہے داستانِ دردِ دل صحنِ قیامت میں
مرا مرنا، تمہاری بے رُخی، احباب کے طعنے
یہ نقشے حشر تک باقی رہیں گے چشمِ عبرت میں
ہر اک ذرّے کے دل میں بھر گیا جوشِ انا اللہی
یہاں تک حُسن نے کی سعی جلووں کی اشاعت میں
ستم کی مشق میں اندیشۂ فردا نہ کر ظالم
غریبوں کی سُنے گا کون آشوبِ قیامت میں

دل ناعاقبت اندیش، کیوں جوشِ مسرت ہے
صدائے نغمۂ ماتم بھری ہے سازِ عشرت میں
عزیزؔ ایسے بھی اربابِ سخن اس دور میں دیکھے
نہ سمجھے فرق کوئی شاعری میں اور خطابت میں

۱۰ر جولائی ۱۹۲۵ء

✻

پرتوِ حسن کہیں انجمن افروز تو ہو
دلِ پُر داغ مرا مایۂ صد سوز تو ہو
کم سے کم کوئی تو ساماں ترے آنے کا کروں
اطلسِ چرخ تو ہو، بسترِ گل دوز تو ہو
رنگ پیر اے چمن جوش میں کلیاں چٹکیں
کھول دے بندِ نقاب آج کہ نو روز تو ہو
دل میں پیوست نہ ہو جو وہ نظر ہی کیا ہے
تیر ترکش میں اگر ہو تو جگر دوز تو ہو
نہ سہی صحبتِ فردوس، جہنم ہی سہی
محفلِ عیش نہ ہو، انجمن سوز تو ہو
کیا نتیجہ ہے عزیزؔ ایسی جبیں سائی سے
بُت کا سجدہ ہو مگر ناصیہ افروز تو ہو

۱۰ر جون ۱۹۲۵ء

✻

میرے دل میں کوئی ہم راز اور ہے سن رہا ہوں، ایک آواز اور ہے
شہپرِ جبریل سے نسبت ہے کیا
طائرِ دل تیری آواز اور ہے
روح پرور ہے دمِ عیسیٰ مگر
اس لبِ مے گوں کا اعجاز اور ہے

اور شے ہے شورِ ہنگامِ نشور
وہ خرامِ فتنہ پرواز اور ہے
کیفِ چشمِ مست ہے اک اور چیز
بادۂ صافیٔ شیراز اور ہے
سرحدیں ہیں عام، ازل ہو یا ابد
میرا انجام اور آغاز اور ہے
چنگِ مطرب سے علاقہ دل کو کیا
یہ مرا ٹوٹا ہوا ساز اور ہے
شاعری کیفِ جوانی تھی عزیز
اب تو رنگِ طبعِ ناساز اور ہے

۱۶/ مئی ۱۹۲۵ء

✲

الحذر! یہ دل اُسی کا فرش پا انداز ہے
بجلیوں کی رو میں جو مستِ خرامِ ناز ہے
سازِ نیرنگِ جہاں بھی کیا انوکھا ساز ہے
مختلف پردے ہیں لیکن ایک ہی آواز ہے
دم رگوں سے کھنچ رہا ہے اور اجل دم ساز ہے
اُس کا کیا انجام ہوگا جس کا یہ آغاز ہے
عقدے کو لاحل بناتی جاتی ہے فطرت اُدھر
ناخنِ تدبیر ادھر وقفِ کشودِ راز ہے
گو لگا دی موت نے لب پر مرے مہرِ سکوت
میری خاموشی میں لیکن دل شکن آواز ہے
تنگیٔ دل سے صدا نکلے تو کچھ تاثیر ہو،
ورنہ یوں تو ہر کلی کے منہ میں بھی آواز ہے
آگئی وہ فصلِ گل، وہ لے اُڑا جوشِ جنوں
جنبشِ موجِ ہوا مجھ کو پر پرواز ہے
انتظارِ موت میں دن کاٹتا ہوں زیست کے

زندگی اب میرے مقصد میں خلل انداز ہے

نازِ ساقی کون اُٹھاتا ہے خمارِ شوق میں
ایک ہی انگڑائی میں در مے کدے کا باز ہے

جارہا ہوں سامنے عرضِ تمنا کے لیے
اشک آنکھوں میں ہیں بھرّائی ہوئی آواز ہے

حُسن کی خود داریاں کب تک حجابِ ناز میں
میں صدا دیتا ہوں تم کو، یہ مری آواز ہے

دل میں جو کچھ تھا وہ آخر لے اُڑی موجِ شمیم
جامۂ ہستی سے باہر اب گلوں کا راز ہے

انتہا دل کی رسائی کی کسے معلوم ہو
یہ بھی کیا روح الامیں کی طاقتِ پرواز ہے

نزع میں ملتے ہیں میرے ہونٹ، سُنیے غور سے
یہ مری آواز ہے یا آپ کی آواز ہے

نغمۂ غم کے سوا اس ساز میں کیا ہے عزیز
عالم اک ٹوٹے ہوئے دل کی مگر آواز ہے

۱۹۲۶ء

✵

خانۂ دل حُسنِ رخ سے گھر گیا — ہر طرف سونے کا پانی پھر گیا
قہر ڈھاتی ہے کسی کی بے رُخی — جب نظر پھیری زمانہ پھر گیا
تیرا کیا کہنا جمالِ ہم نشیں — جو ترے پہلو میں بیٹھا تر گیا
کیا کیا اشک ندامت کیا کیا — میں خود اپنی ہی نظر سے گر گیا
آتش تر سے دھواں اُٹھنے لگا — کاگ اڑے بوتل سے، بادل گھر گیا

کیا تعلق تھا عزیز اُناؤ سے
دل طلسماتِ اثر[1] میں گھر گیا

۱۰؍جون۱۹۲۶ء

۱؎ نواب جعفر علی خاں اثر

شامِ فراقِ ذکرِ جوانی میں کٹ گئی
کیا رات تھی جو ایک کہانی میں کٹ گئی
اب انتظار کیا ہے تجھے اے حریصِ عیش
پیری بھی انتظار جوانی میں کٹ گئی
دل چسپ و دل فریب ہے کیا عیشِ بے ثبات
دنیا کی عمر ایک کہانی میں کٹ گئی
آنکھوں کو شغل گریہ ہمیشہ رہا عزیز
دریا کی ساری عمر روانی میں کٹ گئی

ضبط حکمِ عشق تھا، دل تابعِ احکام تھا
ورنہ یہ طبقے اُلٹ دینا بھی کوئی کام تھا
حُسن تھا، صبحِ ازل تھی، نور کا ہنگام تھا
ذرّے سب کو دے رہے ہیں، جلوہ اتنا عام تھا
ہاتھ میں مخمور ساقی کے چھلکتا جام تھا
چودھویں کا چاند غرقِ بادۂ گل فام تھا
دل نے جب تک اُن نگاہوں سے نہ کھایا تھا فریب
جنبشوں پر جنبشیں، پیغام پر پیغام تھا
میری مشتِ خاک بھی تھی اک تباہی کا پیام
عشق کے آغاز کا یارب یہی انجام تھا
فصلِ گل کا راز سمجھا عشقِ خونیں پیرہن
پردہ ہائے رنگ و بو میں حُسن کا پیغام تھا
روحِ فطرت مضطرب تھی، ذرّہ ذرّہ مشتعل
دل کی خلقت جب ہوئی تھی، وہ بھی کیا ہنگام تھا

عشق کا دفتر ہوا نقشِ سویدا پہ تمام
خاتمے پر مُہر تھی اور مُہر پر اک نام تھا

حُسن کا ہر جلوہ نامحدود، سرشارِ جمال
مبتدائے بے خبر، آغاز بے انجام تھا

ہیچ تھیں نیرنگیاں مینائے نیلی فام کی
موج زن شیشے میں جب تک بادۂ گل فام تھا

کوئی ایسے خط کھلے لاتا ہے، کیوں اے برق طور؟
کس قدر طاقت رُبا، ہمت شکن پیغام تھا

سر کے بل چلنا پڑا آخر دیارِ عشق میں
ذرّے ذرّے پر خدا شاہد کسی کا نام تھا

موت کو جو مرنے والا جانتا تھا زندگی
اُس پر آخر زندگی کا کس لیے الزام تھا

رُخ سے سرکانا نقاب اور جان دینا بے طلب
وہ تمھارا کام تھا اور یہ ہمارا کام تھا

برق کے پردے میں او جھل ہو گیا آنکھوں سے تو
منھ چھپا کر جانے والے مجھ کو تجھ سے کام تھا

بارگاہِ حسن تک پہنچا تو کیا دیکھا عزیزؔ
اِک نظر تھی کارفرما اور قتلِ عام دیکھا

۱۷ر جنوری ۱۹۲۶ء

دیدار کا لطف اے دلِ بے تاب وہیں تھا
ہر جلوۂ مستانہ جہاں چیں بہ جبیں تھا

دنیا کو مٹایا ہے اسی طرزِ عمل نے
جو دل میں ہمارے تھا زباں پر وہ نہیں تھا

گردوں کی کمر روزِ ازل خم ہوئی جس سے
میں تھا کہ اسی بارِ امانت کا امیں تھا
صورت کا تغیر ہے فقط فرق مجازی
جو دید کا طالب ہے، وہی پردہ نشیں تھا
تھی آپ کے آنے کی تمنا مرے دل میں
مفہوم قیامت کا مگر ذہن نشیں تھا
طوفاں کے تھپیڑوں میں تھا جس وقت سفینہ
اے منکرِ حق کون ترے ذہن نشیں تھا
میں نے جو دمِ نزع عزیزؔ ایک نظر کی
عالم ہمہ تن اک نفسِ باز پسیں تھا

۲۰ر جنوری ۱۹۲۹ء

✵

منتشر ہیں ورق زمانے کے
اُف رے انداز مسکرانے کے
رنگ اب اور ہیں زمانے کے
دن گئے ہمت آزمانے کے
اپنا کعبہ الگ بنائیں گے
معتکف ان کے آستانے کے
عرش کو فرشِ راہ پاتے ہیں
جبہہ سا تیرے آستانے کے
ایک پر تو ترے تلون کا
اختلافات ہیں زمانے کے
کب نگاہِ عتاب اُٹھے گی
مدعی تیغ آزمانے کے
دیکھ لیں کاش غور سے مجھ کو
آرزومند دل لگانے کے
زینت زلف و رُخ پہ کیا موقوف
سو بہانے ہیں اک نہ آنے کے
میری نظروں میں وسعتِ کونین
نکتہ چینوں سے اس زمانے کے
اکبرؔ، اقبالؔ، حسرتؔ اور عزیزؔ
معجزے ہیں یہ اس زمانے کے
بجلیاں بن کے گر رہے ہیں عزیزؔ
خار و خس میرے آشیانے کے

۲۱ر دسمبر ۱۹۲۶ء

✵

عالم مجھے ہلکا سا پردا نظر آتا ہے
اس پردے کے اندر اک جلوا نظر آتا ہے

کب راہ ہو طے دیکھیں اور کیا نظر آتا ہے
اب تک تو پس پردہ، پردا نظر آتا ہے

شاید کسی بے کس سے اب ضبط نہیں ممکن
کچھ رنگ زمانے کا بدلا نظر آتا ہے

لو صبح ہوئی رخ سے سرکائے گئے گیسو
خورشید کا پیمانہ چھلکا نظر آتا ہے

اللہ ری دل چسپی آرائشِ ہستی کی
مجھ کو تو کچھ اس میں بھی دھوکا نظر آتا ہے

کرتا ہوں تصور جب میں دل کی تباہی کا
تاحد نظر مجھ کو صحرا نظر آتا ہے

تم لاکھ چھپو لیکن چھپنے سے ہے کیا حاصل
بے تاب تماشا خود جلوا نظر آتا ہے

اک نور پہ نازاں ہے گردوں، مجھے ہر شے میں
خورشید بہ دامن اک جلوا نظر آتا ہے

یہ کہہ کے مسل ڈالا انگشتِ حنائی سے
دل صفحۂ ہستی پر دھبا نظر آتا ہے

کب رنگِ وفا ابھرا عالم کے مرقع میں
یہ دفتر پارینہ سادا نظر آتا ہے

زیبا اسی قامت پر ہے دعوئے یکتائی
جو عالمِ کثرت میں تنہا نظر آتا ہے

بیمارِ شبِ غم کی پلکوں پہ اک آنسو ہے
یا صبحِ قیامت کا تارا نظر آتا ہے

وہ سامنے ہیں پھر بھی جلوے ہیں حجاب آرا
اس پردہ دری میں بھی پردہ نظر آتا ہے
آنکھوں کو عزیزؔ آخر برباد کیا دل نے
جب کیا نظر آتا تھا، اب کیا نظر آتا ہے

✵

نقشِ ہستی پر توِ فانی نظر آیا مجھے
حسنِ دِل کش نے دکھایا ایسا آئینا مجھے
شب کے سناٹے میں ہر تارے پہ دھوکا تھا مجھے
دیکھتا ہے جیسے کوئی دیکھنے والا مجھے
پر توِ نورِ ازل دکھلائے ہر ذرّا مجھے
چاہیے اس طرح سیر وسعتِ دُنیا مجھے
اب یہ عالم ہے کہ کوئی دیکھ سکتا ہی نہیں
دیکھنے والے یہ تونے کس طرح دیکھا مجھے
کُھل گئیں دل کی رگیں، آنکھوں سے بہہ نکلا لہو
ایک انگڑائی میں تونے کردیا رسوا مجھے
چشمِ ساقی سے ہے محرومیِ قسمت کا گِلا
بادۂ پُرکیف سب کو مل گیا، اِلّا مجھے
مضطرب دل، تیری ہر کروٹ ہے پیغامِ وصال
کم نہیں دریا سے ہرگز موجۂ دریا مجھے
دیکھ لی میں نے سجاوٹ انجمن کی دیکھ لی
اپنا جلوہ تو دکھا اے انجمن آرا مجھے
ذرّے ذرّے میں ہے طوفانِ حوادث موج زن
کچھ بتا اِس ہستیِ موہوم کا منشا مجھے
تنگ تھا مجھ پر قفس، کیا جانیے کیسی بنی
ہم صفیرو! اک ذرا آواز تو دینا مجھے

کیا کرامت ہے جو ٹپکا دیدۂ تر سے لہو
چاہیے تھا آسماں سے خونِ برسانا مجھے
عالمِ کثرت میں ہے وحدت کا جلوہ اے عزیز
ایک اک ذرّے پہ کرنا چاہیے سجدا مجھے

✡

کیوں چارہ ساز آئے ہیں بے کار کے لیے
اب تو دُعا کا وقت ہے بیمار کے لیے
وحشت سے میری دشتِ جنوں سرفراز ہیں
ہر آبلہ ہے تاج ، سرِ خار کے لیے
یہ نو بہ نو حجاب ہیں ، یہ تہ بہ تہ نقاب
صرف امتحان طالبِ دیدار کے لیے
دوزخ کی اس دہکتی ہوئی آگ کا مآل !
کافی تھی اک نگاہ گنہ گار کے لیے
شب کا سکوت ، دل کا خلوص ، آنسوؤں کے تار
کیا نعمتیں ہیں دیدۂ بیدار کے لیے
وہ تیری اِک نگاہِ سیاست ، خدا گواہ
دوزخ سے سخت تر ہے گنہ گار کے لیے
یہ آبلے ، یہ درد ، یہ زخمِ جگر خراش
کافی نہیں ہیں لذّتِ آزار کے لیے
اُٹھی تھی چشمِ شوق کہ بے نور ہوگئی
رونا ہے اب تو طاقتِ دیدار کے لیے
پیغام لا رہے ہیں حیاتِ دوام کا
یہ آخری نفس، ترپتے بیمار کے لیے
جوشؔ[1] و اثرؔ ، رواںؔ و جگرؔ ، کیفیؔ و نشاطؔ
یہ گل ہیں میرے گلشنِ بے خار کے لیے

---

[1] جوشؔ ملیح آبادی، نواب جعفر علی خاں اثرؔ، جگت موہن لال رواںؔ، شیام موہن لال جگرؔ بریلوی، کیفیؔ لکھنوی۔

سیراب ہیں عزیزؔ مرے آبلوں سے دشت.
ابرِ کرم ہوں وادیِ پُرخار کے لیے

❋

مرے ناصح مجھے سمجھا رہے ہیں فریضہ ہے، ادا فرما رہے ہیں
دھواں اُٹھتا ہے اِک اک موئے تن سے سزا اپنے کیے کی پا رہے ہیں
طلسمِ ہستیِ فانی دِکھاکر ابھی کچھ دیر وہ بہلا رہے ہیں
جہاں سے کل ہمیں آنا پڑا تھا وہیں مجبور ہوکر جا رہے ہیں
دکھا دیں گے عزیزؔ انجامِ دُنیا
ابھی تو خیر! دھوکا کھا رہے ہیں

❋

دل ہمارا ہے کہ ہم مائلِ فریاد نہیں
ورنہ کیا ظلم نہیں، کون سی بیداد نہیں
حُسن اک شانِ الٰہی ہے مگر اَے بے مہر
بے وفائی تو کُئی حسنِ خداداد نہیں
سر تربت وہ خموشی پہ مری کہتے ہیں
مرنے والے تجھے پیمانِ وفا یاد نہیں
حسنِ آراستہ قدرت کا عطیہ ہے مگر
کیا مرا عشقِ جگر سوز خدا داد نہیں
لاکھ پابندِ علائق نہ رہے کوئی یہاں
طبع وارستہ مگر فکر سے آزاد نہیں
باہم آئینِ وَفا رسمِ محبت کیسی،
وقت اب وہ ہے کہ بندوں کو خدا یاد نہیں
چشم مخمور! وہ ہے قابلِ غرقِ مئے ناب
دفترِ عشق پہ جب تک کہ مرے صاد نہیں

پوچھتے کیا ہو تباہی کا فسانہ مجھ سے
دلِ برباد کی صورت بھی مجھے یاد نہیں

ذرّے ذرّے میں ہے اِک عالمِ معنیٰ پنہاں
خاکِ برباد کو سمجھے ہو کہ آباد نہیں

آپ کہتے ہیں کہ ہے گورِ غریباں ویراں
ایسی بستی تو جہاں میں کوئی آباد نہیں

آنسوؤں کو بھی ذرا دیکھ لے رونے والے
ان ستاروں میں تو دُنیا کوئی آباد نہیں

حسنِ خودبیں نے کیے آئینے کے سو ٹکڑے
اب نہ کہنا کہ نگاہیں ستم ایجاد نہیں

کب خیالات پہ ممکن ہے کسی پہرہ
دل تو آزاد رہا، میں اگر آزاد نہیں

سینہ کاوی کے لیے شرط ہے دل کی ہمت
ناخنِ دستِ جنوں تیشۂ فرہاد نہیں

بے خودی منزلِ عرفاں ہے، ذرا ہوش میں آ
ہے خودی کا یہ نتیجہ کہ خدا یاد نہیں

طبقۂ خاک میں ہے عالمِ خاموش آباد
جس کو برباد سمجھے ہو وہ برباد نہیں

دلِ ویراں کی تباہی کی کوئی حد ہے عزیزؔ
میں سمجھتا ہوں کہ دنیا ابھی آباد نہیں

✻

تری کوشش ہم اَے دل! سعیِ لاحاصل سمجھتے ہیں
سرِ منزل تجھے بیگانۂ منزل سمجھے ہیں

اصولِ زندگی جاں دادۂ قاتل سمجھتے ہیں
نہ سر کو سر سمجھتے ہیں نہ دل کو دل سمجھتے ہیں

غریقِ بحرِ اُلفت، آشنائے قلزمِ معنی
جہاں پر ڈوب کر اُبھریں اُسے ساحل سمجھتے ہیں

دیارِ عشق کے ساکن زمیں پر پاؤں کیا رکھیں
یہاں کے ذرّے ذرّے کو جب اپنا دل سمجھتے ہیں

کریں کیا اُن سے شکوہ جو کسی کے دل جلانے کو
فروغِ گرمیِ ہنگامہ محفل سمجھتے ہیں

جھکانا آستاں پر سر کوئی مشکل نہیں لیکن
جبینِ بندگی کو ہم کب اس قابل سمجھتے ہیں

شکستہ دل لیے یہ سوچ کر اس بزم سے نکلا
شکایت کیجیے اُن سے جو دل کو دل سمجھتے ہیں

یہ دل حاضر ہے، بسم اللہ وہ کھولیں گرہ اس کی
اگر آسان حلِ عقدۂ مشکل سمجھتے ہیں

لبِ فریاد اگر کھولوں تو کیا ہنگامہ برپا ہو
خموشی کو مری جب گفتگوئے دل سمجھتے ہیں

وہ خلوت ہو کہ جلوت ہو تجلی ہو کہ تاریکی
جہاں تم ہو اُسی کو ہم بھری محفل سمجھتے ہیں

ارادہ ہو تو دل مضبوط کر اے ڈوبنے والے!
جب ایسا وقت ہو دھارے کو بھی ساحل سمجھتے ہیں

دمِ آخر رُکا ہے ایک آنسو دیدۂ تر میں
اسی کو ہستیِ ناکام کا حاصل سمجھتے ہیں

وفا کی حد دکھا کر جلنے والے دل، خدا حافظ!
تجھے بھی اک چراغِ کشتۂ منزل سمجھتے ہیں

مٹا ڈالا مجھے، پھر بھی یہ ہے بیداد کی حسرت
ابھی فہرستِ موجودات میں شامل سمجھتے ہیں

مرا طرزِ سلوک اس راہ کے رہ رو نہ سمجھیں گے
مگر جو راہ بر راہِ حق و باطل سمجھتے ہیں

نثارِ دوست ہے یہ موتیوں کا بے بہا مالا
ہر اک آنسو کو ہم ٹوٹا ہوا اک دل سمجھتے ہیں

جنھیں معلوم ہے تیری نگاہِ ناز کا عالم
وہ اپنے ضبط کے دعووں کو خود باطل سمجھتے ہیں
عزیز افکارِ دنیا اور مشاغل شعر گوئی کے
احبّا کی محبت ہے جو اس قابل سمجھتے ہیں

✵

کِس کِس انداز سے ہوتے ہیں وہ پنہاں ہم سے
دیکھ لیتے ہیں مگر آئینہ ساماں ہم سے
تیرہ و تار ہوا قالبِ انساں ہم سے
روح سے ہم ہیں خجل، روح پشیمان ہم سے
نہ بیاباں ہے موافق نہ گلستاں ہم سے
ساز کرلے تو ہی تو اے گورِ غریباں ہم سے
کعبہ و دَیر کی راہیں ہیں گریزاں ہم سے
کفر آزردہ ہے اسلام پشیماں ہم سے
جادۂ کفر بنائی گئی سرِ منزلِ دوست
شکوہ کرتا ہے یہ زنّارِ رگِ جاں ہم سے
تیر کھایا ہے وہ دل پر کہ الٰہی۔ توبہ!
بس ہوا ہے یہی اک کارِ نمایاں ہم سے
آئینہ خانے میں اے زلف بنانے والے!
دیکھے جاتے نہیں اب خوابِ پریشاں ہم سے
بجلیاں ٹوٹ پڑیں گی دلِ بے تاب ابھی
ہل بھی جائے گا اگر پردۂ ایواں ہم سے
صبحِ محشر ہو بپا، ظلمتِ دُنیا چھنٹ لے
کیوں چھڑاتے ہو ابھی گوشۂ داماں ہم سے۔
خونِ گل رنگ بہا دیدۂ تر سے اکثر
بارہا فاش ہوا رازِ گلستاں ہم سے

زندگی کٹ گئی جلتے ہوئے ، شعلہ نہ اُٹھا
سوزِ دل سیکھ لے اے شمع شبستاں ہم سے

چشم ساقی سے نکلتی ہے نگہ یہ کہہ کر
ہے کوئی ساغر لب ریز کا خواہاں ہم سے

نہ چلا فطرتِ مجبور پہ قابو نہ چلا
آہ ! پامال ہوئی رفعتِ انساں ہم سے

ضبط وحشت کا زمانہ نہیں، دشوار ہے اب
خندۂ زیرِ لب و گریۂ پنہاں ہم سے

کیا کریں، کس سے کریں دل کی تباہی کا گلہ
اپنا گھر اپنے ہی ہاتھوں ہوا ویراں ہم سے

ہیں خس و خارِ نشیمن میں بہت کچھ دعوے
لے ملائیں تو نوا سنجِ گلستاں ہم سے

سانس لینے میں اب اُڑتی ہیں لہو کی چھینٹیں
کیا چھپائے سے چھپے کاوشِ مژگاں ہم سے

پھونک دے سوزِ نہاں پیکرِ خاکی اتنا
کوئی ذرہ نہ ہو آلودۂ عصیاں ہم سے

یہ صدا دیتے ہوئے تا درِ رحمت پہنچے
مول لے گا کوئی سرمایۂ عصیاں ہم سے

آنکھیں پتھرا گئیں کیوں، کس کی تجلی دیکھیں
کچھ بتاتے ہی نہیں دیدۂ حیراں ہم سے

یادِ ایامِ طرب خیز کہ زندہ تھے عزیزؔ
کم تھے اس مے کدے میں مست و غزل خواں ہم سے

✵

جو نہ سمجھے ، فائدہ ایسے کے سمجھانے سے کیا
مدعا آخر بتاؤ تم کو دیوانے سے کیا

فائدہ دیوانگی میں اس کو سمجھانے سے کیا
ضبط کی پابندیاں ممکن ہیں دیوانے سے کیا ؟
تو نہاں ہے یا عیاں، یہ عقدہ سلجھا دے زرا
اے حجاب آرا ملے گا میرے اُلجھانے سے کیا
عقدۂ دل کھولو یا دل کی پریشانی مٹاؤ
بال بکھرانے سے کیا اور زلف سلجھانے سے کیا
ہوں شہیدِ کس میرسی اور قتیل بے کسی
شور ماتم کا اُٹھے میرے عزا خانے سے کیا
واعظِ شیریں سخن جس پر نہ خود عامل ہو تو
فائدہ منبر پہ ایسے وعظ فرمانے سے کیا
ساقیا ! شامل نہ ہو جس میں ترا کیفِ نگاہ
کام مے خواروں کا نکلے ایسے پیمانے سے کیا
آنکھ جب ساقی نے پھیری ، جام چھلکا عمر کا
زندگی کا راز وابستہ تھا پیمانے سے کیا
ذرّہ ذرّہ تھا مرا عیش و طرب کی داستاں
سننے والے سُن، صدا آتی ہے ویرانے سے کیا
طور جل کر خاک ہو، بے ہوش ہوں اہلِ نظر
فائدہ اس طرح آخر آنکھ جھپکانے سے کیا
عشق نے برباد کر ڈالیں ہزاروں ہستیاں
کوئی ٹکڑا لے گیا ہے میرے افسانے سے کیا
ذرہ ذرّہ کہہ رہا ہے جب ہماری داستاں
اب چھپائیں رازِ دل ہم اپنے بیگانے سے کیا
پھاند پڑتا آگ میں سمجھا ہے معمولی سا کام
کہہ دیا ہے شمع کے شعلے نے پروانے سے کیا
گھٹ رہا ہوں اضطرابِ شوق ہی میں دیر سے
دیکھ تو ساقی دھواں اُٹھتا ہے پیمانے سے کیا
گوشۂ خلوت ہے اور سیر دو عالم ہے عزیزؔ
کیا بتائیں لطف ملتا ہے کتب خانے سے کیا

آؤں نہ پلٹ کر تو مجھے لاکھ صدا دے
محفل سے اُٹھانا ہے تو اس طرح اُٹھا دے
اس نقش نے تجھ سے مجھے بیگانہ بنایا
احسان کر اتنا، مری ہستی کو مٹا دے
نیرنگیِ دنیا سے نہ کھائے کوئی دھوکا
یہ نقش ہے ،باطل ،تو اسے جلد مٹا دے
اب دیر نہ کر، دل کے ارادے ہیں بہت کچھ
ہاں ہاں ! جو مٹانا ہے اُسے جلد مٹا دے
پھر دیکھ تماشا کہ اُبھرتا ہوں میں کیوں کر
جتنا تجھے منظور مٹانا ہو، مٹادے
پیمانہ بکف رند ہیں، چھائی ہیں گھٹائیں
ساقی سے کہو، قلزمِ ذخّار بہا دے
دم لے گی کہیں آہِ دروں تاب کسی کی
کونین کو جب تک کہ نہ افسانہ بنا دے
اک آہ میں دنیا کا بدل جائے گا نقشہ
دل ،میرا کہا مان کہ یہ آگ دبا دے
غیروں کو مری ہستیِ پُر مایہ پہ ہو رشک
اے دل ! کہیں دردِ ابدی تجھ کو خدا دے
یہ گرمیِ محفل ہے تری ذات پہ موقوف
ہاں آتشِ دل، اور کوئی شعلہ بڑھا دے
اندازِ تغافل، ارنی گو سے کہاں تک
یہ رسم پرانی ہے بہت، اس کو اُٹھا دے
ہر آبلہ پا میں عزیزؔ ایسی تپک ہے
ڈرتا ہوں کہ بن میں نہ کہیں آگ لگا دے

✵

مے کشوں کو مے کشی پر ناز ہونا چاہیے
یوں درِ مے خانہ ساقی باز ہونا چاہیے
داد خواہی حشر میں ہم کس توقع پر کریں
کوئی تو اتنوں میں ہم آواز ہونا چاہیے
داستانِ عمرِ رفتہ سننے بیٹھا ہے کوئی
پھر سے دورِ زندگی آغاز ہونا چاہیے
ختم پر آئی ہے میری داستانِ زندگی
اب تمھیں بھی گوش بر آواز ہونا چاہیے
اب ہوا اس گلشنِ ایجاد کی ناساز ہے
ہم صفیرو! مائلِ پرواز ہونا چاہیے
ہم صفیرانِ چمن سے اُڑتے جاتے ہیں عزیز
اب ہمیں بھی مائلِ پرواز ہونا چاہیے

✵

حصارِ ظلم و قلبِ ناتواں ہے
نظر تک آسماں ہی آسماں ہے
مرے اور اُن کے فصل اتنا کہاں ہے
تجلی ہی تجلی درمیاں ہے
یہ ظاہر ہے، یہ باطن بے نشاں ہے
یہ دنیا داستاں ہی داستاں ہے
دلِ گم کردہ منزل بے نشاں ہے
زرا آواز تو دینا کہاں ہے
سنبھل کر کوچہ جاناں کہ رہ رو
یہاں کا ذرّہ ذرّہ آسماں ہے
تلاطم خیز موجیں اُٹھ رہی ہیں
شکستہ کشتیِ عمرِ رواں ہے
ہوا میں اڑ رہے ہیں جس کے تنکے
یہی شاید ہمارا آشیاں ہے
نشیمن تک مرا ویرانگی میں
ہوا کے دوش پر بارِ گراں ہے
گزشتہ عیش کا نقشہ ہے آگے
قفس جب سے قریب آشیاں ہے
نہ پوچھو منزلِ گم کردہ منزل
جہاں بیٹھوں وہیں پر آشیاں ہے
چمن ہے اور وہ خورشیدِ سیما
بہارِ زندگانی بے خزاں ہے
خدا جانے کہوں کیا اس کے آگے
مرے کہنے میں کب میری زباں ہے
اگر وہ رخصتِ فریاد دے دے
زمیں پھر ہے نہ دورِ آسماں ہے

نہ دے موقع کہ نالہ کوئی کھینچوں ستم گر! یہ دکھے دل کی فغاں ہے
گرا تھا طور پر جو برق بن کر وہی تنکا بنائے آشیاں ہے
مری پرواز سے واقف نہیں وہ مجھے گھیرے ہوئے کیوں آسماں ہے
یہ اوراقِ پریشاں دیدنی ہیں ہر اک گل داستاں در داستاں ہے
عزیزؔ اب کچھ نہیں قابو زباں پر
قریبِ ختم شاید داستاں ہے

۱۶ر فروری ۱۹۳۳ء

قدم رکھا الٰہی کس چمن آرائے فطرت نے
اُداسی پھول برسانے لگی گورِ غریباں پر
جب اَبروئے زلیخا پر شکن پیدا ہوئی غم سے
چمک اٹھا ہلالِ یک شبہ تاریک زنداں پر
طلسمِ رازِ کن کا ٹوٹنا حسنِ حجاب آرا!
فقط تھا منحصر آوازۂ چاکِ گریباں پر
اُداسی اب کسی کا رنگ جمنے ہی نہیں دیتی
کہاں تک پھول برسائے کوئی گور غریباں پر
تلافی اک لہو کی بوند کی بھی ہو نہیں سکتی
ہزاروں سال روئے ابر اگر خاکِ شہیداں پر

لہو دل کا عزیزؔ اب رائگاں کرنے سے کیا حاصل
لکھے جاتا ہوں اپنے تجربے دیوار زنداں پر
یہ مختصر شبِ فرقت کی داستاں سن لو
کہ روزِ حشر پہ صرف ایک رات بھاری تھی
تمام عمر جلا اور کبھی دھواں نہ اُٹھا
یہ کیسا راز تھا یہ کیسی رازؔ داری تھی
بس ایک شمع کا شرمندہ تھا مزارِ عزیزؔ
نہ سوگوار تھا کوئی نہ سوگواری تھی

پس ہمت کبھی اسلاف کی تائید تو کر
نہ سہی مردِ عمل کوشش تقلید تو کر

جنبش ابروئے ساقی میں ہے طغرائے ہلال
ساز و سامان طرب جمع ہیں سب عید تو کر

خود تجلی ہے طلبِ گار تماشا غافل
جلوے بیتاب ہیں لیکن ہوسِ دید تو کر

چاہیئے ظرف کی وسعت بھی بقدرِ مظروف
جوشِ رحمت کے موافق کوئی اُمید تو کر

نفسِ سرکش ترے قابو میں نہیں ہے یہ غلط
خوگر جبر تو ہو ضبط کی تاکید تو کر

موت کے بعد ہے آغازِ کتابِ ہستی
پہلے دنیا سے گزر ختم یہ تمہید تو کر

خاک ساروں کی حقیقت نظر آئے گی عزیز
پہلے ہر ذرے میں نظارۂ خورشید تو کر

۲۰/اکتوبر ۱۹۳۲ء

✲

رفتہ رفتہ غم میں تکمیلِ مقاصد ہو گئی
میری ہر آہِ رسا خود میری قاصد ہو گئی

سوزِ دل سے مجھ کو آخر کام لینا ہی پڑا
برق کو جب آشیانے سے مرے ضد ہو گئی

کارِ ہفتاد و دو ملت کر دیا اُس نے تمام
اک نگہ میں صاف تردید عقائد ہو گئی

طور کا افسانہ سن کر آنکھ اُٹھ سکتی نہیں
اب نظر مدت سے پابندِ قواعد ہو گئی

رسم الفت اٹھ گئی نامِ محبت مٹ گیا
ہر طبیعت وقفِ تحصیلِ فوائد ہو گئی

سرگزشتِ طور ہے میرے لیے ہمت شکن
خیر جاتا ہوں اگر قسمت مساعد ہو گئی

بس اُسی کو آج کل اُستاد کہتے ہیں عزیز
اک جماعت جس کی کورانہ مقلد ہو گئی

۳۰/جنوری ۱۹۳۳ء

✲

ناشناسوں کو کہیں اپنا پتا دیتا ہے
کوئی محرم ہو تو وہ پردہ اُٹھا دیتا ہے

چھک گئے اک نظرِ مست میں ہم اے ساقی
پینے والوں کو خدا یوں ہی پلا دیتا ہے

گئے وہ دن کہ مرے دل میں دبے تھے شعلے
اب تو اک ایک نفس آگ لگا دیتا ہے

عشق ہے شعلۂ پُر پیچ، نہاں ہو کہ عیاں
جلنے والوں کو بہر طور جلا دیتا ہے

یا الٰہی دلِ خوں گشتہ کا انجام بخیر
آج کچھ اور خبر رنگِ حنا دیتا ہے

درد کہتے ہیں جسے ہے وہ حیاتِ ابدی
نہیں ملتا ہے، مگر جس کو خُدا دیتا ہے

طالبِ دید سرِ طور ہو بے ہوش مگر
تیری تصویر کا پردہ تو ہلا دیتا ہے

ممتحن شانِ کریمی کا ہے دامانِ عزیز
دیکھنا ہے کہ فقیروں کو وہ کیا دیتا ہے

۱۰/فروری ۱۹۳۳ء

ISBN : 81-7160-105-7